یو جی سی کیر لسٹیڈ بین الاقوامی پیر ریویو ریفریڈ جنرل

انڈیکس نمبر ۲۵

سہ ماہی

دہلی

تاریخ ادب اردو

اردو ادب کا نقیب و ترجمان

جلد۔۳

اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۱

شمارہ۔۴

مدیر: ڈاکٹر محمد یحی صبا

سہ ماہی دہلی

تاریخ ادب اردو

اردو ادب کا نقیب و ترجمان

جلد:۳ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱) شمارہ:۴

سرپرست اعلیٰ: ارتضٰی کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر واثق الخیر ایسوسی ایٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد بہلول

خط و کتابت/ترسیل زر کا پتہ

سہ ماہی تاریخ ادب اردو دہلی، ۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabji Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-07

E-mail:editorurdu@gmail.com

website:tareekheadabeurdu.com

Mobile No.:+91-9968244001

اس شمارہ کے مشمولات سے مدیر/وابستگان کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی تحریر/اقتباس کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔ ''تاریخِ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حقِ سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

UGC Care Listed International Peer Reviewed Refereed Journal. ISSN:2582-1229/E-ISSN:2582-9157

سرپرست:

ڈاکٹر راکیش کمار پانڈے ☆ پروفیسر رئیس انور رحمٰن ☆ پروفیسر محمد رضی الرحمٰن

ڈاکٹر پرمود کمار بھارتی ☆ پروفیسر کوثر مظہری

مجلس مشاورت

بیرون ملک:

پروفیسر یوسف خشک (پاکستان)، پروفیسر ضیا حسن (پاکستان)، ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی (پاکستان)، ڈاکٹر سمیرا بشیر (پاکستان)، پروفیسر ثمینہ گُل (پاکستان)، پروفیسر احمد القاضی (مصر)، پروفیسر حلیل طوقار (ترکی)، پروفیسر اسومان اوذکین (ترکی)، پروفیسر دُرمُش بُلگر (ترکی)، ڈاکٹر ذکائی کارداس (ترکی)، فرزانہ اعظم لطفی (ایران)، ڈاکٹر علی بیات (ایران)، ڈاکٹر محمد کیومُرسی (ایران)

اندرون ملک:

پروفیسر خالد اشرف، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر نوشاد مومن، ڈاکٹر دانش الہ آبادی، ڈاکٹر مجیب احمد خان، پروفیسر آلِ ظفر، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر افروز عالم، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، ڈاکٹر رحمٰن اختر، ڈاکٹر شاہد رزمی، ڈاکٹر متھن کمار، ڈاکٹر بلرام شکلا، رضوان ندوی، ہاجرہ نور، احمد زریاب۔

قانونی مشیر: ایڈوکیٹ انل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ

زر تعاون:

فی شمارہ-/50	خصوصی شمارہ-/200
سالانہ-/1000	خصوصی تعاون-/5000

A/C Name:- PEACE INDIA FOUNDATION

A/C No.:- 51521131001918

IFSC:- PUNB515210

مالک، طابع وناشر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا نے جے کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس، سے چھپوا کر دفتر ''تاریخ ادب اردو'' ۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷ سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ:		4
اردو کے علامتی افسانہ نگار: رتن سنگھ	محمد شاکر	6
نظیر اکبرآبادی کی شاعری	اعلم شمس	16
''اردو'' اور ''ڈھونڈھاری''	مصور احمد	24
منفرد اقبال شناس: پروفیسر ایوب صابر	ضیا تسنیم	33
ناصر ملک: رنگین دنیا کا ایک گمنام شاعر	ڈاکٹر محمد یحی صبا	47
سائنسی فکشن مائکرو فکشن کے خصوصی حوالے سے	غلام مصطفیٰ	59
جنوبی کشمیر میں ایک سنجیدہ شاعر: شوریدہ کاشمیری	ڈاکٹر نصیر احمد ڈار	66
عصر حاضر میں کشمیر میں فارسی ادب کی اہمیت	ڈاکٹر شبیر احمد وانی	69
جموں وکشمیر میں آزادی کے بعد اردو صحافت	ڈاکٹر نصرت بانو	82
اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں سماجی واخلاقی۔۔۔۔	ڈاکٹر تسنیمہ پروین	85
مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی خدمات	ڈاکٹر واثق الخیر	94
روفیدہ الاسلمیہ عصر جدید کی مسلم خواتین کے لیے۔۔۔۔	ڈاکٹر علی محمد بٹ	103
ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط	راشد قادری	108
جموں وکشمیر اور اردو افسانے کے شارحین	ڈاکٹر فیاض احمد ڈار	126
کشمیر میں دین اسلام کے مبلغ میر سید علی ہمدانی۔۔۔۔	مبارکہ موسوی	135
علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا ادبی جائزہ	آصف علی احمد	145
ولی دکنی کی شاعری میں تصور عشق	ڈاکٹر سیف الدین احمد	162
The Role of "Zuljanah"	Dr. Farhat Fatima	176

اداریہ

قارئین! سہ ماہی تاریخ ادب اردو کا اکتوبر تا دسمبر شمارہ آپ کے ٹیبل پر موجود ہے۔ گزشتہ شمارہ ہم نے زبیرالحسن غافل پر نکالا تھا جسے بہت پذیرائی ملی۔ اس شمارے میں مختلف مضامین شامل ہیں۔ہم نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ وہ سارے مضامین نظر ثانی کے بعد شامل کر لیے جائیں جو ہمیں موصول ہوئے تھے۔ اگر کوئی مضمون شامل ہونے سے رہ گئے ہیں تو آئندہ شمارے میں جگہ دی جائے گی۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نومبر کا مہینہ اردو ادب کے لیے بہت خاص ہے وہ اس لیے کہ اردو کے مایہ ناز شاعر جسے شاعر انقلاب کہا جاتا ہے یعنی علامہ اقبال اور خطیب عصر، مرد مجاہد اور ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کا یوم ولادت ہے۔ اسی طرح جنگ آزادی کے روح رواں شیر میسور ٹیپو سلطان کی بھی پیدائش اسی ماہ میں ہوئی تھی۔ اسی مہینے میں رومان اور انقلاب کے شاعر فیض احمد فیض کا یوم وفات بھی ہے۔

علامہ اقبال کی فلسفیانہ شاعری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین اور تقاریر اردو ادب کے سرمائے ہیں۔ اسی طرح فیض احمد فیض کی شاعری ایک طرف محبت کی دعوت دیتی ہے تو دوسری طرف آزادی کے خواب کی تکمیل کی طرف لوگوں کی للکارتی بھی ہیں۔

اکیسویں صدی کا دو دہائی گزر چکے ہیں، تیسری دہائی میں ہم قدم رکھ چکے ہیں۔ پچھلے دو سال سے دنیا تھم سی گئی ہے۔ روزگار کے بڑے مسائل پیدا گئے ہیں۔ نوجوانوں کی ایک فوج کھڑی ہوگئی ہے جو بے روزگاری کی وجہ سے ذہنی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے طالب علم زیادہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ انھیں روزگار کے بڑے مسائل ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آنے والا سال نوجوانوں کے لیے بہتر ہوگا۔ ملک میں خوشحالی آئے گی۔ کسانوں

کے مفاد میں بھی سرکار نے قانون کو واپس لے لیے ہیں۔ امید ہے کہ زراعت کے میدان میں بھی بہتری آئے گی۔ ہمارا ملک زراعت کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ ہندوستان دنیا کے دیگر ممالک کو غلہ فراہم کرتا تھا، اب بھی ایسے مواقع آئیں گے۔

ادب کے سلسلے میں گزشتہ دو تین سال بہتر رہا۔ کئی افسانے اور ناول منظر عام پر آئے۔ کئی انگریزی ناولوں کے اردو میں ترجمے ہوئے۔ سمیناروں کا سلسلہ بھی حسب معمول جاری رہا۔ البتہ مشاعروں کا انعقاد تھم سا گیا تھا۔ آن لائن مشاعرے ضرور ہوئے لیکن اس میں مشاعروں کی وہ رونق سامنے نہیں آئی جو روایتی مشاعروں کی تھی۔ اب حالات بہتر ہو رہے ہیں، ساری رکاوٹیں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ ادب خوب پروان چڑھے گا۔ لکھنے والے خوب لکھیں گے، شاعری کرنے والے اپنے تجربات کو شاعری میں ڈھالیں گے۔ افسانے خوب لکھے جائیں گے۔ ناولوں میں نئے نئے تجربے کیے جائیں گے۔ اردو پڑھنے اور لکھنے کا انداز بدلے گا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اردو کو عالمی ادب کے زمرے میں رکھا جانے لگے گا۔

قارئین! آپ کا رسالہ دن بہ دن بہتری کی طرف جا رہا ہے۔ یو جی سی نے آپ کے رسالے کو کیئر لسٹیڈ زمرے میں شامل بھی کر لیا ہے یہ ہمارے اور آپ کے لیے خوش آئند بات ہے۔ یہ سب ہماری اور آپ کی اردو سے بے لوث محبت کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ ہمارے سرپرست پروفیسر ارتضی کریم اور اڈیٹوریل ٹیم کے خاص ممبر ڈاکٹر راکیش کمار پانڈے نے رسالے کو یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل کرنے میں بہت مدد کی۔ پروفیسر ارتضی کریم کی رہنمائی میں ہمارا رسالہ صف اول میں شمار ہونے لگا ہے۔ ان کی اردو زبان و ادب سے والہانہ محبت کی وجہ سے رسالے کی زبان میں نکھار آ رہا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے قارئین پروفیسر ارتضی کریم کی رہنمائی میں نکلنے والے اس رسالے سے مستفید ہوں گے اور اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کریں گے۔ قارئین اردو ادب سے مزید دلچسپی لیتے ہوئے افسانے، کہانی، شاعری اور سفرنامے وغیرہ میں طبع آزمائی کریں گے اور رسالے میں اپنی تخلیقات شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ہمیں قیمتی مشوروں سے نوازیں۔

مدیر

اردو کے علامتی افسانہ نگار: رتن سنگھ

محمد شاکر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج، سوائی مادھوپور، راجستھان

ملخص

رتن سنگھ عہد حاضر کے فکشن نگاروں میں اپنا منفرد اور مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا جو کہ شاید ان کا اصل میدان نہیں تھا اور جلد ہی اردو افسانہ نگاری کی طرف رُخ کرلیا۔ رتن سنگھ نے اردو میں افسانے، افسانچے، ناولٹ کے علاوہ شاعری میں نظمیں اور دوہے لکھے ہیں۔ انہوں نے پنجابی زبان کے افسانوں، ناولوں، شلوکوں، گیتوں اور نظموں کے اردو میں ترجمے بھی کیے ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی اور ہندی میں بھی کئی تصانیف لکھی ہیں۔ رتن سنگھ نے اردو نثر اور شاعری دونوں میں اپنی آپ بیتی ''دربدری' اور ''ہڈ بیتی'' کے نام سے لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کئی کہانیاں اور افسانے مختلف کلاسوں، اداروں، اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ان کی نظمیں اور دوہے بھی ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

رتن سنگھ کے یہاں افسانہ نگاری کی ایک نئی تکنیک اور منفرد اسلوب ہے جو انہیں دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ کرتا ہے۔ اختصار و جامعیت ان کے افسانوں کا محور ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت علامت نگاری ہے۔ تقسیم کے درد اور ہجرت کے کرب نے ان کے خیال و افکار میں نئی تبدیلیاں پیدا کردی۔ جس کا عکس ان کی تمام تر تصنیفات اور تخلیقات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق کے ادراک و فہم نے ان کے فن کو روشنی اور دلکشی بخشی ہے۔

رتن سنگھ کا انداز بیان ایسا ہے جو آسانی سے قاری کو سمجھ آجاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ حالانکہ ان کی زبان پر پنجابی کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے

پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ معمولی باتوں کو اپنی تخلیقی صلاحیت کی بنا پر افسانوی رنگ دینے میں ماہر ہیں۔ان کے افسانوں اور کہانیوں میں حقیقی زندگی سے تعلق رکھنے والے جیتے جاگتے انسان کردار کے طور پر نمایاں ہیں۔ان کا حساس دل اور فنکارانہ ذہن ذات پات، مذہب وملت اور رنگ ونسل کی قید سے آزاد ہے۔انہوں نے اردو فکشن میں اپنے منفرد انداز تحریر اور تخلیقات کے ذریعے تاریخ ساز اضافے کیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ رتن سنگھ اردو افسانہ نگاری میں اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں۔

☆☆☆

عہد حاضر میں اردو فکشن کی دنیا میں رتن سنگھ کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ان کے زرخیز قلم سے اردو فکشن میں بے شمار اضافے ہوئے ہیں۔رتن سنگھ اردو ادب میں افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور اپنی انفرادیت وموضوعات کی بنا پر اردو افسانے کو ایک نئی سمت ورفتار عطا کی۔جہاں تک رتن سنگھ کے افسانوی ادب کا تعلق ہے تو اس کے مطالعہ سے ہمیں رتن سنگھ کی زندگی کے گہرے مشاہدات، تجربات، انسانی نفسیات اور حالات کے اتار چڑھاؤ کا پتہ چلتا ہے۔رتن سنگھ اردو کے وہ سنجیدہ تخلیق کار اور حساس فنکار ہیں جو اپنے فکر وفن سے ہی اردو ادب میں پہچانے جاتے ہیں۔

رتن سنگھ کا شمار یوں تو اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔چاہے افسانہ نگار کی حیثیت سے ہو یا فن اور موضوع کے لحاظ سے، وہ اپنے دور کے ادیبوں میں مختلف نظر آتے ہیں۔لیکن اردو ادب میں رتن سنگھ افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔رتن سنگھ نے اپنے افسانوں میں سماج کی خارجی حقیقتوں کے بجائے انسانی ذات کی داخلی حقیقتوں کا پتہ لگایا اور بیانیہ کی جگہ علامت نگاری کا اپنے افسانوں میں اظہار کیا۔ان کے کچھ افسانوں کو تمثیل کے پیرائے میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔کیوں کہ ان میں جا بجا جادوئی ماحول اور مافوق الفطری عناصر بھی موجود نظر آتے ہیں۔

رتن سنگھ کے ادبی سفر کا آغاز تقسیم ملک کے بعد سے ہوتا ہے جب وہ پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی۔۱۹۵۳ء میں رتن سنگھ کی ملاقات جب رام لعل سے ہوئی تو ان کے کہنے پر کہانی اور افسانہ لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔رتن سنگھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنے ادبی دوستوں کی محفل میں سنایا کرتے تھے۔اس وقت انہوں

نے اپنی پہلی کہانی ''ممی تم ایک دیوار ہو'' لکھی۔''ہادی'' ان کی دوسری کہانی ہے جو ان کے پہلے افسانوی مجموعے''پہلی آواز'' میں شامل ہے۔اس طرح کہانی لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں لکھی۔مگر ان کی واضح شناخت ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''پہلی آواز'' کے شائع ہونے کے بعد ہوئی۔

رتن سنگھ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور متعدد افسانوں کے خالق ہیں۔اپنی ادبی زندگی کے دوران انہوں نے کثرت سے افسانے تحریر کیے ہیں ان کے افسانوں کے چھ مجموعے''پہلی آواز''،''پنجرے کا آدمی''،''کاٹھ کا گھوڑا''،''پناہ گاہ''،''پانی پر لکھا نام'' اور''گیارہ بجنے میں سترہ منٹ'' شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔جن سے اردو کے افسانوی ادب کے سرمائے میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔رتن سنگھ نے ناولٹ بھی لکھے ہیں جن میں''صبح کی پری''،''اڑن کھٹولا'' اور ''سانسوں کا سنگیت'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ رتن سنگھ نے نثری خودنوشت ''دربدری'' اور ایک طویل نظم''ہڈبیتی'' کے عنوان سے لکھی ہیں۔ان کے دوہوں کے دو مجموعے ''روپ انوپ'' اور''رتی کے دوہے'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

رتن سنگھ نے کئی بہترین افسانچے تحریر کیے ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ''مانک موتی'' خاص طور پر مشہور ہیں۔انہوں نے''بیتے ہوئے میرے دن'' کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ رتن سنگھ نے اردو کے مختلف کہانی کاروں اور اپنے ادبی حلقے کے دوستوں پر تخلیقی کہانیاں لکھی ہیں جو ''ایک ندی نام سرسوتی'' کے نام سے شائع ہوئی۔ان کے ساتھ ہی رتن سنگھ نے پنجابی زبان کے ناولوں، افسانوں، گیتوں، نظموں اور شلوکوں کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔پنجابی اور ہندی زبان میں بھی ان کا نثری سرمایہ موجود ہے۔

رتن سنگھ نے تقسیم ملک کے کرب کا سامنا کیا تھا اور اس کا اثر ان کی ذاتی زندگی، خیال وافکار اور تمام تر تصنیفات وتخلیقات میں نمایاں نظر آتا ہے۔انہوں نے زندگی کی غمنا کیاں بھی دیکھیں اور حالات کی مجبوریاں بھی دیکھیں۔ان کی شخصیت پر انہیں حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے گاؤں، مکان، زمین، دوست واحباب سے بچھڑنے کا درد بھی گہرا اثر رکھتا ہے۔انہوں نے جو کچھ دیکھا محسوس کیا، حساسیت کے ساتھ اپنے افسانوں میں تحریر کر دیا۔وہ پاکستان سے

ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ظاہر ہے تقسیمِ ملک کا دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک جگہ رتن سنگھ لکھتے ہیں :

''میری مایوسی دراصل لکھنؤ سے مایوسی نہیں تھی۔ یہ تو ملک کی تقسیم کے بعد اس زخمی انسان کی مایوسی تھی، جس سے وہ دھرتی چھن گئی تھی جہاں کبھی اس نے آنکھیں کھولی تھیں، وہ لوگ چھن گئے تھے جن سے وہ محبت کرتا تھا۔جس کے زخمی دل پر محبت کا پھاہا رکھنے والا لکھنؤ میں کوئی نہ تھا۔ایسا کوئی نہ تھا جو اُسے گلے لگائے اور اس کے غم کا شریک ہوتا۔اُسے ڈھارس بندھاتا۔''(۱)

''پہلی آواز'' رتن سنگھ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل ۲۷ افسانے ہیں ۔ یہ افسانے رتن سنگھ کی ابتدائی کاوشوں کا نتیجہ ہے جن میں انہوں نے اختصار اور ایجاز کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔''پہلی آواز'' افسانے میں ریلوے پلیٹ فارم پر بھیک مانگ کر پیٹ بھرنے والے ایک عام بچے کی کہانی پیش کی گئی ہیں۔لیکن وہ بچہ جب ایک دن محنت اور مزدوری کر کے پیسہ کماتا ہے تو اسے اپنے اندر ایک نئی ہمت اور قوت کا احساس ہوتا ہے اور یہی جذبہ اس بچے کو ایک حساس، سنجیدہ اور باوقار انسان بنانے میں مدد کرتا ہے۔اس وقت اس بچے کے دل سے جو آواز نکلتی ہے، رتن سنگھ نے اسی آواز کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ایک اقتباس میں مصنف لکھتے ہیں :

''منّا نے خون سے بھری ناک اٹھا کر پہلے تو چپراسی کی طرف حسرت سے دیکھا اور پھر دوسرے لمحے مٹھی میں پکڑے ہوئے نوٹ کی طرف اسے احساس ہوا کہ یہ آواز اس کے کانوں میں پہلی بار آئی تھی۔ بالکل پہلی بار۔کوئی اسے بتا رہا تھا کہ اب وہ خود اپنے پیسوں سے بھی آم خرید سکتا ہے۔''(۲)

اس کہانی میں مصنف نے ایک بھیک مانگنے والے بچے میں محنت ومشقت کا جذبہ پیدا ہونے پر حساسیت اور خودداری کے ساتھ زندگی گذارنے پر توجہ خیال کیا ہے۔

رتن سنگھ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''پنجرے کا آدمی'' ہے جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں ۴۰ افسانے شامل ہیں۔''پنجرے کا آدمی''، تقسیم ملک کے وقت پیدا ہوئے حالات

اور واقعات کو پیش کرنے والی ایک ایسی کہانی ہے جس میں انسان کی بے بسی اور لاچاری کو موضوع خیال بنایا گیا ہے۔ وہ انسان ایسے حالات میں پھنس گیا ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے آپ کو ساکت سا ایک پنجرے میں قید ہونا تصور کر لیتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کی زندگی کو بہتر طریقے سے جینے کی کوشش کرتا ہے لیکن ماضی کے خیالات اور تصورات اسے اس پنجرے سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ اور آخر تک اسے خوش حالی اور ترقی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ ایک اقتباس میں مصنف لکھتے ہیں :

''یہ سنتے ہی اس کا دماغ چکرا گیا اور مارے درد کے بے ہوش ہوتے ہوئے اس نے اپنا سر پتھر کی نوک پر یوں ٹکا دیا جیسے ابدی نیند سونے کی تیاری کر رہا ہو۔ اب وہاں جھاڑیاں ہیں، پتھر ہیں، اسے نگل لیا ہو۔ اسے وہاں نہ پاکر تاروں پر بیٹھے ہوئے پرندے حیرانی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ آدمی کہاں گیا جوان جھاڑیوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔''(۳)

اصل میں یہ کہانی عہد حاضر کی اس حالت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس میں انسان ترقی کی منزلوں کو طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے لیکن اپنی روایتوں سے کنارہ کر اخلاقی اقدار کو ختم کرتا جا رہا ہے۔

رتن سنگھ کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''کاٹھ کا گھوڑا'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۳۱ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ''کاٹھ کا گھوڑا'' بیانیہ نوعیت میں لکھی ایسی کہانی ہے جو بظاہر علامتی نوعیت کی نہیں ہے لیکن قدم قدم پر علامتی معنی پیش کرتی ہے۔ جس سے مصنف کے منفرد انہ اندازِ بیاں، فنی اور تخلیقی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے ملک کے غریب اور مزدور طبقے کے لوگوں کے حالات اور دکھ درد کو مصنف نے کہانی کا موضوع بنایا ہے۔ کہانی میں جو شخص بے جان ٹھیلے کو کھینچ رہا ہے اس کی خود کی حالت بے جان اور ساکت کاٹھ کے گھوڑے جیسی ہوگئی ہے۔ مصنف رقمطراز ہیں :

''کاٹھ کے گھوڑے میں قدم اٹھانے کی ہمت نہیں۔ وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا۔ اور اس کے پیچھے بھیڑ میں وہ وزیر رکا ہوا ہے جسے کسی غیر ملکی وفد سے وقت مقررہ پر بات کرنا ہے، وہ ڈرائیور اٹکا ہوا ہے جسے ملک کے کسی دوسرے شہر کی طرف ریل گاڑی لے کر جانا ہے، اسکول کے وہ بچے رکے ہوئے ہیں جو کل کے مالک ہوں

گے۔ڈاکٹر،نرس،انجینئر سب کے قدم بندھ کر رہ گئے ہیں۔اور بندو کاٹھ کا گھوڑا اندھیر دیو کے بازار میں اپنے ٹھیلے کے ساتھ کھڑا ہوا ہے۔اس کے پاؤں میں حرکت آئے تو زندگی آگے بڑھے۔''(۴)۔

اس کہانی کے ذریعہ مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ نیا کی ترقی غریب اور مزدور طبقے کی ترقی پر منحصر ہے۔جب تک معاشی اعتبار سے انسان برابر نہیں ہوجاتے تب تک انسانی ترقی ناممکن ہے۔دراصل یہ کہانی اس سماجی سسٹم کا خاکہ پیش کرتی ہے جس میں ہر آدمی کی رفتار کی اپنی اہمیت ہے اور کسی ایک آدمی کے رک جانے سے سارا سسٹم رک جاتا ہے۔

''پناہ گاہ''رتن سنگھ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جس میں کل ۱۵ افسانے ہیں اور یہ مجموعہ ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں شامل ''پناہ گاہ'' تصوراتی انداز میں لکھی ایسی کہانی ہیں جس میں مصنف کے تقسیم کے بعد پاکستان سے ہندوستان آنے اور اپنے مکان کے اس کمرے جس میں مصنف رہتے تھے،تصور ہی تصور میں اپنے ساتھ ہندوستان لانے اور جو پریشانی کے وقت مصنف کی پناہ گاہ ہوتی تھی کو موضوع خیال بنایا ہے۔یہ وہ کمرہ ہے جہاں انسان اور جانور ساتھ رہتے تھے اور وہ مصنف کی اپنے گاؤں،گھر،زمین،کھیت،کھلیان سے وابستگی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

رتن سنگھ نے اپنے خیالات اور احساسات کو بہت ہی عمدہ اور تصوراتی انداز میں پیش کر ایک اعلیٰ فنکار اور تخلیق کار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں :

''رات کو سویا تو میں اپنے کمرے میں تھا،اپنے پلنگ پر۔لیکن جب صبح جاگا تو میں نے اپنے آپ کو اس اندھیرے کمرے میں پایا جسے میں پاکستان بنتے وقت ہندوستان لایا تھا۔اس اندھیرے کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹا ہوا میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ موت کی وادی سے نکل کر محفوظ جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔رات کے آخری پہر میں میں نے بڑا ہی بھیانک سپنہ دیکھا تھا جس میں خوفناک جانور مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔سپنے میں ان بھیانک جانوروں سے بچنے کے لیے میں نے ہمیشہ کی طرح اس کمرے میں پناہ لی تھی۔''(۵)

''پناہ گاہ''تقسیم ملک اور فسادات کے موضوع پر لکھی ایسی کہانی ہے جس میں تقسیم کے

المیہ کو بڑے درد بھرے انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ انسانی رشتوں اور روایتوں کے دھیرے دھیرے ختم ہونے کو بھی غور وفکر کا مرکز بنایا ہے۔

رتن سنگھ کا پانچواں افسانوی مجموعہ ''پانی پر لکھا نام'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں ۱۳۳ افسانے شامل ہیں۔''پانی پر لکھا نام'' مصنف کی ایسی کہانی ہے جس میں وقت کے گزرنے کو دریا کے بہاؤ سے مماثلت دے کر بیان کیا گیا ہے۔انسان کو اپنی زندگی میں کامیابی اور کامرانی کے ساتھ ساتھ ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔وہ اپنے کارناموں کی بنیاد پر اپنا نام زندہ جاوید رہنے کا تصوراتی خیال کرتا ہے لیکن کبھی کبھی اسے شک وشبہ بھی رہتا ہے کہ مرنے کے بعد اسے بھلا دیا جائے گا۔جس طرح دریا کے پانی پر لکھا نام لہریں مٹا دیتی ہے اسی طرح اس کا نام بھی زمانے میں باقی نہ رہے گا۔لیکن پھر بھی کہانی کا کردار بار بار پانی پر نام لکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ وہی دریا کنارے بیٹھے ایک بچے کے بار بار مٹی کا گھروندا بنانے کی کوشش اسے قوت اور حوصلہ دیتی ہے۔ایک اقتباس میں مصنف رقمطراز ہیں :

> ''اور میں اس کے پانی پر اپنا نام لکھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔میرے حروف لکھے جانے سے پہلے ہی یوں مٹے جا رہے تھے جیسے کہتے ہوں اہم اور غیر اہم کام ماضی کا حصہ بنتے ہی پگڈنڈی پر بننے والے زندگی کے نشانوں کی طرح مسافروں کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی مٹ جاتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ اس پر چلتا ہوا کون بشر گذر گیا۔لیکن میں تھا کہ بڑی محنت سے بڑے انہماک کے ساتھ یہ کام یوں کر رہا تھا جیسے کوشش کرتے رہنے سے مجھے کبھی نہ کبھی کامیابی مل جائے گی۔''(۶)

اس افسانے میں مصنف نے کہانی کے کردار کی بار بار پانی پر نام لکھنے کی کوشش پر توجہ خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انسان جو بھی کوشش کرتا ہے اس میں ایک نہ ایک دن کامیابی ضرور ملتی ہے۔کئی بار کوشش کرنے والا انسان سوچتا ہے کہ اُسے کامیابی نہیں ملے گی لیکن ایسا نہیں ہے۔

''گیارہ بجنے میں سترہ منٹ'' رتن سنگھ کا چھٹا اور آخری افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں کل ۱۴۳ افسانے ہیں۔''گیارہ بجنے میں سترہ منٹ'' افسانے

میں مصنف نے وقت کے ٹھہراؤ کو زندگی میں پیش آنے والے تقاضوں اور دشواریوں سے مماثلت دے کر بیان کیا ہے۔ بارش ہونے کی امید لیے لوگوں کا مہاتمہ کے پاس جانا اور خالی ہاتھ لوٹنا ایسا ہے جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ اس کی وجہ سے بھوک، بیماری اور غریبی جیسے روگ لوگوں کی امیدوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ زندگی جب ایسے حالات سے گذرتی ہے تو سب اطراف میں وقت ٹھہرا ہوا سا لگتا ہے۔ کہانی میں مصنف نے سماجی اور معاشی تفرقہ کی بنیاد پر پیدا ہوئے انتشار اور انسانی رشتوں کے ختم ہونے کو وقت کے ٹھہراؤ سے مثال دے کر علامتی انداز میں اپنے فکر وفن کا مظاہرہ کیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں :

''میں سہمی سہمی نظروں سے دیوار کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ وقت اسی طرح گیارہ بجنے میں سترہ منٹ پر ٹھہرا ہوا ہے۔ ایسے جیسے دنیا کے کروڑوں لوگ ہزاروں سالوں سے زندگی میں پیچھے چھوٹ جانے پر دردرتا کے اندھیروں میں جکڑے پڑے ہیں۔ ان کے لیے دیوار گھڑی پر ابھی بھی گیارہ بجنے میں سترہ منٹ ہیں۔ یہ وقت آگے کو سرکے تو ان کا دکھ درد دور ہو۔'' (۷)

رتن سنگھ نے اپنی ادبی زندگی کے سفر میں بیشتر افسانے لکھے ہیں اور افسانہ نگاری میں اپنی انفرادیت کی بنا پر اردو فکشن میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے ان کی ذاتی زندگی اور گزرے ہوئے لمحات کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ رتن سنگھ کے افسانوں اور کہانیوں کے بارے میں ناقدین کا خیال ہے کہ وہ اداسی سے لبریز ہوتی ہے۔ ہجرت کا کرب، زندگی کی غمناکیاں اور حالات کی مجبوریوں نے ان کے قلم کو درد وغم کی سیاہی میں ڈبو دیا۔ اس لیے کہا بھی جاتا ہے کہ رتن سنگھ نے اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔ ان کی تحریریں، ان کے احساسات اور خیالات کی سچی ترجمان ہے۔ انہوں نے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے واقعات اور حادثات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر محمد نعمان رتن سنگھ کی تحریروں کے متعلق لکھتے ہیں:

''رتن سنگھ سادہ زبان اور چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعہ چونکہ دینے والی باتیں کرنے کے ہنر سے واقف ہیں جس کے سبب ان کے افسانوں میں سچائی کے ساتھ ساتھ دلچسپی بھی اخیر تک قائم رہتی ہے۔ ان کے افسانے مختصر ہونے

کے باوجود معنویت اور بصیرت سے بھرپور ہیں۔ ان کی ہر کہانی ایک خاص مقصد کی حامل ہوتی ہے۔''(۸)

رتن سنگھ کے افسانوں میں اختصار و جامعیت اور مختلف موضوعات کی فراہمگی شدت سے دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں حساسیت کے ساتھ ایک خاص طرح کی کشش ہوتی ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں رتن سنگھ کہتے ہیں:

''اختصار کا راستہ علامت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ سے پہلے کے افسانہ نگاروں جیسے کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے پریم چند کے بعد کہانی اپنے ہاتھ میں لے لی اور ایک ہی جست میں انہوں نے کہانی کو عالمی معیار پر پہنچا دیا۔ ہماری نسل کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان حضرات کی موجودگی میں اپنی کوئی پہچان بنا سکے۔ اس لیے ہر شخص نے اپنی پہچان بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ اختیار کیا۔ جدیدیت میں علامتیں غیر واضح ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی کہانیاں بھی لوگوں کو سمجھ نہیں آتیں۔ میری تمام کہانیاں علامت کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔''(۹)

رتن سنگھ کے افسانوں میں سماجی مسائل سے متعلق موضوعات پر بڑے منصفانہ انداز میں بحث کی گئی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں نیچریت، کلاسیکیت، نفسیات، حقیقت اور جدیدیت کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ رتن سنگھ نے اردو، ہندی، پنجابی کے علاوہ عام بول چال اور روز مرہ کی زبان کا استعمال اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ وہ افسانے کے فن کو زبان و بیان کے عمدہ استعمال سے پرکشش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ رتن سنگھ نے اپنی تمام صلاحیتیں معیاری افسانے لکھنے میں صرف کی ہیں۔ فنی اعتبار سے انہوں نے اردو افسانے کو حقیقت نگاری کی جن روایات سے روشناس کرایا اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر رتن سنگھ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

حواشی:

(۱)۔رتن سنگھ، بیتے ہوئے دن، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۱۳ء، ص ۲۵۶

(۲)۔رتن سنگھ، پہلی آواز، نصرت پبلشرز، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴

(۳)۔رتن سنگھ، پنجرے کا آدمی، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۳ء، ص ۱۶

(۴)۔رتن سنگھ، کاٹھ کا گھوڑا، رگھبیر پبلشرز، جبل پور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱

(۵)۔رتن سنگھ، پناہ گاہ، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳

(۶)۔رتن سنگھ، پانی پر لکھا نام، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

(۷)۔رتن سنگھ، گیارہ بجنے میں سترہ منٹ، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

(۸)۔سونیئر مجلس فروغ اردو ادب، قطر، ۲۰۱۰ء

(۹)۔انٹرویو، راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، ۱۵ر نومبر ۲۰۰۸ء، ہفتہ وار

نظیر اکبرآبادی کی شاعری

اعلم شمس
اسسٹنٹ پروفیسر، ذاکر حسین دہلی کالج،
دہلی یونیورسٹی

نظیر دہلی میں 1735 میں پیدا ہوئے اور نادر شاہ کے حملے کے وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی نانی کے یہاں آگرہ آ گئے تھے۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز، مخمور اکبرآبادی، مولانا عبدالباری، مولانا اشرف لکھنوی، فرحت اللہ بیگ، پروفیسر محمد حسن اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ نظیر اپنی ماں کے ساتھ 23-22 سال کی عمر میں آگرہ آئے جب کہ یہ غلط ہے۔ قطب الدین باطن جو نظیر کے شاگرد تھے، انھوں نے اپنے تذکرۂ 'گلستانِ بے خزاں' میں لکھا ہے کہ نظیر صغرسنی میں اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ گئے۔ باطن کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہ نظیر کے شاگرد تھے پھر اگر نظیر جوانی میں دلّی چھوڑتے تو ان کی شاعری میں دلّی کی زبان، دلّی کے حالات کچھ تو ان کی شاعری میں ہوتا کیوں کہ بچپن کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں۔

نظیر آگرے میں نوری دروازے میں رہتے تھے۔ گلزار علی اور امامی بیگم دو بچے تھے۔ نظیر کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ نظیر نے اپنی جوانی میں زندگی کے عیش و آرام، تفریح اور مذاق سب میں حصہ لیا تھا۔ کھیل کود، کنکوئے بازی، تیراکی، کثرت، کشتی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، غرض کہ ہر طرح کا مزا لیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تہواروں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ بڑے بڑے دعوت نامے انھیں آگرے سے دور نہ لے جا سکے۔ انھیں آگرے سے عشق ہو گیا تھا۔ یہاں کی ہوا میں رادھا اور کرشن کی محبت اور بھگتی کے گیت گونج رہے تھے۔ وہ ایک بند میں آگرے سے لگاؤ کو یوں بیان کرتے ہیں:

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملّا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

فرحت اللہ بیگ نے 'دیوانِ نظیر' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ: ''طبیعت میں استغنا بہت تھا۔ واجد علی شاہ نے بلایا، نہیں گئے۔ محمد حسن نے بھی واجد علی شاہ کے بلانے کی بات کہی ہے جب کہ یہ بات غلط ہے کیوں کہ واجد علی شاہ 1846 میں نواب بنے اور نظیر کا انتقال 1830 میں ہو گیا تھا۔ نظیر نے ایک طویل عمر پائی۔ انھوں نے آرام بھی اٹھایا اور زندگی کے دکھ بھی سہے۔ انھوں نے عشق و محبت کی بازیاں بھی لڑیں اور خانقاہوں کا رخ بھی کیا۔ آگرے میں لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ 1830 میں نظیر کا انتقال ہوا اور وہ جس نیم اور بیری کے پیڑ کے نیچے بیٹھتے تھے وہیں ان کی قبر بنی۔ نظیر کی خدا پرستی کے سبب ان کی وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے انھیں بڑا صوفی فقیر سمجھا اور وہ ان کی قبر پر ہر سال میلہ لگانے لگے۔

نظیر کو درباروں سے کوئی واسطہ نہ تھا جس کے سبب ان کے کلام میں وہ رنگ نہیں پایا جاتا جو دربار سے متعلق شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ درباروں سے نہ جڑنے کی وجہ ان کی سادگی تھی۔ عوام سے ان کی دلچسپی تھی، ان کی شاعری عوام کی زبان میں عوام کے لیے عوام کی جگہ سے پیدا ہوتی تھی۔ انھوں نے کبھی اپنی شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شعر کہتے وقت کبھی خواص کے ذوق اور ان کی پسندیدگی پر واہ نہ کی۔ وہ شعر کہتے تو اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لیے یا عوام کی فرمائش پر۔ نظیر بازار میں کھڑے ہیں، لڈو بیچنے والے نے لڈو پر شعر لکھوائے تو ککڑی بیچنے والے نے ککڑی پر شعر لکھوائے تو ریچھ کا تماشا دکھانے والے نے ریچھ کے پنجے پر نظم لکھوالی۔ نظیر عوام کے دکھ درد کا شاعر ہے، اسے اونچے محلوں اور قلعوں سے کوئی لینا دینا نہیں، اسے آگرے سے اور آگرہ باسیوں سے پیار تھا۔ وہ جمنا کی لہروں اور براندابن کی فضاؤں سے محبت کرتا تھا اور اس کے اسی عوام کی شاعری کے لگاؤ کی وجہ سے اردو تنقید میں بے توجہی کا شکار ہونا پڑا۔ ناقدوں اور تذکرہ نگاروں نے عموماً نظیر کو ناپسند کیا۔ اگر ان کا ذکر کیا بھی تو سطحی طور پر۔ اردو کے ابتدائی تذکروں نکات الشعرا، مخزنِ نکات

اور تذکرۂ شعرا میں نظیؔر کا ذکر نہیں ملتا۔ بعد کے تذکروں میں ذکر ملتا ہے۔ شیفتہؔ نے اپنے تذکرے میں نظیؔر کو بازاری شاعر بتایا۔ نظیؔر کے شاگرد قطب الدین باطنؔ نے اپنے تذکرے 'گلستانِ بے خزاں' میں شیفتہؔ کو منہ توڑ جواب دیا۔ نظیؔر پر سب سے اہم نظر پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ڈالی۔ انھوں نے نظیؔر پر اپنی کتاب ''زندگانیِ بے نظیر'' لکھ کر بے نظیر بنا دیا۔

نظیؔر عوامی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ وہ خود بھی عوامی زندگی کے ہنگاموں، عوام کے ہنسی قہقہوں کے سکھ دکھ، ان کے کھیل تماشوں اور تفریحات میں برابر کے شریک ہیں۔ اگرچہ دورِ مغلیہ کے عہدِ زوال کے شاعر تھے لیکن چوں کہ وہ قدرتاً رجائی یعنی Optimistic انسان تھے۔ حالات کی تباہی و بربادی کو وہ دوسرے نظریے سے دیکھتے تھے۔ وہ دنیا سے دل ہٹانے کی بات کرتے تھے اور کہتے تھے یہ سب مال و دولت اور حکومت جانے والی چیزیں ہیں، اس کا دکھ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی نظریے کے تحت انھوں نے نظم 'بنجارہ نامہ' لکھی۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ اور عام آدمی کے درد کو کم کرنے کے لیے انھوں نے 'آدمی نامہ' لکھی۔ دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی۔ زندگی اور عوام سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کی زبان بھی وہی ہے جو اس زمانے کے اکبرآباد کے عوام کی زبان تھی۔ نظیؔر کے یہاں الفاظ کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ نظیؔر بہت بڑا حقیقت نگار ہے، وہ زندگی کے ہر رُخ کو نہایت ہی صداقت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے۔

نظیؔر نے غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مخمس، مسدس، مثمن، معشر، قطعہ بند، ترکیب بند، ترجیع بند، بحرِ طویل اور تضمین بر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظیؔر نظم کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، ان کا بڑا مشہور شعر ہے:

صحرا میں میرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا

ان کا زمانہ اردو شاعری میں غزل کے شباب کا زمانہ ہے۔ میرؔ کے آخری دور سے لکھنؤ کے ابتدائی دور تک چند مثنویوں اور قصیدوں کو چھوڑ کر اردو شعرا کا سرمایۂ کمال غزلیں ہیں۔ حالاں کہ

نظیر نے غزل کی بادشاہت کو چیلنج کرتے ہوئے نظم نگاری کا جھنڈا گاڑا اور ترقی پسند نظریے کی بنیاد رکھی۔ چوں کہ غزل اشراف اور دربار کی نمائندگی کرتی تھی جب کہ نظیر عوام کے شاعر تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نظیر نے بلاامتیازِ مذہب وملّت جس طرح سے میلوں ٹھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ ان کی سیکولر طرز کا غماز ہے۔ نظیر صرف نظریات تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے عملی زندگی میں تجربے کی بھٹی میں سلگ کر نفرت وحسد کی رنگ کو صاف کیا۔ نظیر کے زمانے کے حالات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو نفرت وبُغض کی گھاٹیوں سے نکال کر مساوات، بھائی چارگی اور رواداری کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ صوفیوں کی خانقاہوں میں ہندوؤں اور سنتوں کے استھان پر مسلمانوں کے ہجوم لگنے لگے۔ نظیر نے ان حالات کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ پروفیسر شہباز کے بقول فقرا کے تکیے پر سریع الاعتقادی اور عجائب پرستی نے ان دنوں ہندوؤں کا بھی ایک بڑا بھاری میلہ لگا رکھا تھا یہی حالات جوگیوں اور سنیاسیوں کے استھانوں میں مسلمانوں کا تھا۔ اسلام اور کفر دونوں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ شیخ وبرہمن نے آپس میں صلح کر لی تھی۔

نظیر کو ہر طرف وحدۃ الوجود کے جلوے نظر آتے تھے۔ وہ ہر ذرّے میں خدا کا جلوہ مانتا تھا یعنی ہر میں ہری اس کا فلسفہ تھا، اسی لیے مہادیو، کرشن جی وغیرہ اس کے نزدیک لائق احترام تھے۔ نظیر اصل میں کبیر اور گرونانک کے عقیدے کا آدمی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو زیادتی کا شکار مانتا تھا۔ نظیر دراصل صلحِ کل کا جویا تھا یعنی سب کو گلے لگانے والا، اس کے نزدیک آدمی آدمی سب برابر تھے اسی لیے نظیر عداوت کا دشمن تھا۔ مذہب کے فرق سے انسانیت میں فرق کرنے کا وہ مخالف تھا، اس کے نزدیک جس کو ہندو اوتار کہتے ہیں اس کو مسلمان پیغمبر کہتے ہیں۔ نظیر کی ایک حمد کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہوگا جس میں انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ سب کا معبود ایک ہی ہے، اسے چاہے جس نام سے پکارو:

کوئی خالق، باری، رب، مولا، رحمان، رحیم، اللہ، تنگری
کوئی الکھ روپ کرتار کہے، نرنکار، نرنجن، نردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سجدے، کوئی بولے شیو شیو ہری ہری
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

نظیر کو دیر وحرم میں کوئی زیادہ فاصلہ نظر نہیں آتا۔ قرآن اور پوتھی دونوں کو وہ ایک ہی

جز دوان میں رکھتے ہیں۔ وہ صوفی کو جوگی اور اور زاہد کو بھوگی سے گلے ملتے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تسبیح اور سمرن دونوں ایک ہی ہاتھ سے پھیری جاتی ہے۔ وہ کنٹھے اور سنگھ سے بھی اذان کی آواز سنتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار
کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار
بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی خوار
زخمی کوئی ماندہ کوئی اچھا کوئی بدکار
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

رام بابو سکسینہ کے بقول نظیر **الوحدۃ فی الکثرۃ** کے دل سے قائل اور با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں ان سے دلی محبت رکھتے اور ان کو اپنا شیدا اور گرو سمجھتے تھے۔ صوفی ازم اور بھگتی ازم دونوں کی دھاراؤں نے نظیر کی زندگی کے چشمے کو سیکولرزم کی موجوں سے لبریز کر دیا تھا۔

نظیر نے تمام مذاہب کے یکساں احترام کی سیکولر اسپرٹ کو اپنے کلام میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی مکمل آئینہ دار ہے۔ ایک دیندار مسلمان ہونے کے باوجود وہ جس عقیدت سے پیغمبر کے نواسوں اور داماد کے معجزات کو نظم کر سکتا ہے وہ اس عقیدت سے گرونانک، بلدیو اور کرشن چندر جی کے بھی گن گاتا ہے۔ نظیر کی نظمیں سیکولر خیالات اور رجحان کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں بے تعصبی، مذہبی رواداری اور تمام مذاہب کے یکساں احترام کی اسپرٹ پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔

نظیر نے ہر ہندستانی تیوہار کو اپنا تیوہار اور ہر مذہبی پیشوا کو اپنا رہنما سمجھا۔ دیوالی، ہولی، راکھی، عید، شبِ برات، کنہیا جی کا جنم، بانسری، ہولی کی بہار، برسات کی بہاریں وغیرہ نظمیں شاعر کی حب الوطنی، وسیع النظری، بے تعصبی، انسان دوستی اور خلاقانہ شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ نظیر نے

جو نظمیں ہندو تیو ہاروں اور غیر مسلم رہنماؤں پر لکھی ہیں۔ وہ فکر وفن کے اعتبار سے اسلامی نظموں سے کہیں زیادہ موثر اور دلپذیر ہیں۔ ان میں نظیؔر کا فن نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ ان نظموں میں نظیؔر نے جو جانکاری دی ہے وہ بڑے بڑے پنڈت کے بس کی بات نہیں ہے۔

اردو ادب میں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی جہاں مسلمان شاعروں نے ہندو دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کی مدح کی ہے اور ہندو شعرا نے حمد، نعت اور منقبت لکھی ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں جذبے کی صداقت واحترام اور عقیدت اسی طرح کارفرما ہے جس طرح اس مذہب کے ماننے والوں کے دل میں ہوتی ہے۔ ہندو اوتاروں کی شان میں مسلمان شعرا نے یا پیغمبرِ اسلام کی شان میں ہندو شعرا نے جو کچھ لکھا ہے اسے اگر جمع کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں اور یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ اگر ان کے لکھنے والوں کے نام ظاہر نہ کیے جائیں تو یہ بتانا مشکل ہوگا کہ ان نظموں کا لکھنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔ کنور مہندی سنگھ بیدی کا شعر ہے کہ:

عشق ہوجائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

اردو کے تمام شعرا کے یہاں تمام مذاہب کا یکساں احترام یا مذہبی رواداری نظر آتی ہے لیکن نظیؔر اکبر آبادی نے اردو شاعری کے دھارے کو جس طور سے گنگا جمنی دھارے میں تبدیل کر دیا ہے اس کی مثال کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

نظیؔر کا وطن آگرہ صدیوں سے خاص تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ اس تہذیب کو مغل شہنشاہ اکبر نے بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اس سے پہلے ولبھاچاریہ کی قیادت میں بھکتی تحریک براندبن، متھرا اور آگرہ کے علاقے میں چپّے چپّے پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھی۔ برج کا یہ علاقہ اپنی مقامی بولی برج بھاشا کی رنگینی، جاذبیت، لطافت اور اسلوبِ بیان کی سادگی کی وجہ سے یکا یک شمالی ہند پر چھا گیا اور شاید برج بھاشا کی اسی خوبی نے محمد حسین آزاد کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ بہرحال نظیؔر کی پرورش اسی تہذیبی ماحول میں ہوئی۔ نظیؔر نے آگرے میں ہونے والے ہر قسم اور ہر مذاہب کے تہواروں میں بھرپور حصہ لیا اور تقریباً ایک صدی کی عمر تو رنگ ونسل، قوم وقبیلے اور مذہب وملّت، امیر وغریب کے اختلافات کو نظرانداز کرتے ہوئے انسانوں سے محبت کرنے میں صرف کر دیا۔

اردو مثنویوں میں جو سیکولرزم دیکھنے کو ملتا ہے کہ مسلم بادشاہ ہے لیکن نجومی اور پنڈتوں کی پوتھیوں پر یقین رکھتا ہے۔ وہ مثنوی کے کردار کی مجبوری ہوتی ہے لیکن نظیر نے نظم میں جس سیکولر انداز کو اپنایا ہے وہ کردار کی مجبوری نہیں بلکہ عقیدت اور دل کی گہرائی ہے۔

نظیر نے سیکولر اسپرٹ کے تحت تین طرح کی نظمیں لکھی ہیں:

(1) بین المذہبی شخصیتوں اور رہنماؤں کی شان میں

(2) بین المذہبی تہواروں پر

(3) تہواروں کے موقعے پر لگنے والے میلوں ٹھیلوں پر

پہلی قسم میں اسلام اور ہندو اور سکھ مذہب کے رہنماؤں پر نظمیں لکھی ہیں۔ سکھ مذہب پر صرف ایک نظم ہے جو انھوں نے گرونانک جی پر لکھی ہے:

ہیں کتنے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید سبھی بر لائے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب شیس نوا اور اَرداس کرو ہر دم بولو واہ گرو

نظیر چوں کہ مسلمان ہیں لہٰذا ان کی اسلامی شخصیتوں پر لکھی گئی نظمیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندو مذہب کے اوتاروں اور رہنماؤں پر نظیر نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں سب سے زیادہ نظمیں شری کرشن جی پر لکھی ہیں۔ درگا جی، بھیروں جی، مہادیو جی اور بلدیو جی پر بھی نظمیں لکھ کر مذہبی رواداری اور سیکولر ہونے کا واضح ثبوت دیا ہے۔ کرشن جی پر زیادہ نظمیں لکھنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ برندابن، متھرا اور آگرے کے علاقے میں کرشن بھکتی ذرّے ذرّے میں سمائی ہوئی تھی جس کو نظیر نے اندر تک محسوس کیا اور پھر ان کی عقیدت کے تار میں جھنکار پیدا ہوئی۔ اگر سری کرشن سے متعلق نظیر کی تمام نظموں کو جمع کر دیا جائے تو سری کرشن کی اچھی خاصی سوانح (Biography) تیار ہو جائے گی۔

حواشی:

۱-شمس الحق عثمانی: نظیر نامہ، صبوحی پبلی کیشنز، دہلی، 1979
۲-عبدالباری آسی: کلیاتِ نظیر اکبرآبادی، رام کمار پریس وارث نول کشور، لکھنؤ، 1951
۳-علی احمد فاطمی: نظیر اکبرآبادی، نصرت پبلی کیشنز، لکھنؤ، 1983
۴-محمد حسن: نظیر اکبرآبادی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1994
۵-مرزا فرحت اللہ بیگ: دیوانِ نظیر اکبرآبادی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 1924

''اردو'' اور ''ڈھونڈھاری''

مصور احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج،
سوائی مادھوپور۔راجستھان

زبان کسی بھی قوم کے افکار ونظریات، تہذیب وثقافت اور عقائد وخیالات کی عکاسی کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ ایک دم وجود میں نہیں آجاتی بلکہ اس کی نشوونما میں صدیوں کے تجربات اظہار، باہمی میل جول اور اشتراک عمل مددگار ہوتے ہیں۔ نسلی اور تاریخی اعتبار سے دنیا کی زبانیں آٹھ بڑے خاندانوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ ان زبانی خاندانوں میں سب سے اہم خاندان ہند یوروپی ہے۔ کیوں کہ اس میں اکثر ایسی زبانیں داخل ہیں جو اپنے اعلیٰ علمی وادبی ذخیروں کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ لسانی گروہ دیگر لسانی خاندانوں کے مقابلے میں نہایت وسیع ہے۔ برصغیر ہندوپاک میں زیادہ تر اسی خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس زبان کی قدیم شکل ہمیں رگ وید میں ملتی ہے۔ یہ آریائی زبان کی تاریخ کا نقطۂ آغاز تھا۔ ایران میں جن زبانوں کا ارتقاء ہوتا ہے وہ ہندیورپی شاخیں کہلاتی ہیں۔ ان شاخوں کا دوسرا گروہ ہندوستان میں وارد ہوتا ہے جسے ماہرین لسانیات ہندآریائی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے تاریخی ارتقا کا تعین کرتے ہوئے مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''یہ امر یقینی ہے کہ ہندیورپی زبان بولنے والے آریائی اپنے داخلۂ ہند سے قبل عرصہ تک مشرقی ایران میں قیام کر چکے تھے۔ جہاں ان کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی دو ہزار قبل مسیح تک 'ہند ایرانی منزل' تک پہنچ جاتی ہے۔ ''ہندیورپی'' زبان کی یہ 'ہندایرانی' شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی

جاسکتی ہے جو بعد کو ایران میں پھیلیں اور جسے آریا بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔''[۱]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'آریہ' لوگ ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں پھیل گئے۔ جیسے جیسے مختلف علاقوں میں پھیلتے گئے ویسے ویسے ایک منظّم معاشرے کی شکل اختیار کر کے استحکام حاصل کرتے رہے۔ ان کی زبان مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب، پورے ملک میں پھیل گئی۔ اور اس زبان پر علاقائی بولیوں کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ سنسکرت اور پراکرت کی شکل میں دونوں زبانوں نے صدیوں قبل مسیح میں دراوڑوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ نتیجتاً اس زبان کی مرکزیت ختم ہونے لگی، اس طرح سنسکرت کی تین علاقائی شکلوں ''ادیچیہ' مدھیہ دیش، اور پراچیہ کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔

آریہ لوگوں کو اپنی زبان مستحکم کرنے کی فکر ہوئی تو انھوں نے زبان کا وقار قائم رکھنے کے لیے مدھیہ دیس کی زبان کو بھی قدر کی نظر سے دیکھا اور تعصّبات سے اوپر اٹھ کر ہر علاقہ کی مقامی زبان کے مخصوص الفاظ شامل کر کے ایک خاص قسم کی ٹکسالی زبان استعمال کرنے لگے۔ ملک کے جن حصوں میں آریہ پھیل چکے تھے، وہاں کے مذہبی، علمی اور ادبی طبقوں میں سنسکرت اچھی طرح بولی اور سمجھی جانے لگی۔ اس زبان نے مذہب اور ادب کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ مگر دھیرے دھیرے عوام سے اس کی دوری بڑھنے لگی۔ اور یہ زبان صرف اشرف واعلیٰ طبقے تک سمٹ کر رہ گئی۔

ہمیں اس بات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ راجستھانی زبان، اردو زبان سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔ یہ زبان راجستھان میں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے جانی جاتی ہے۔ میواڑ میں مارواڑی، مارواڑ میں مارواڑی، جے پور میں ڈھونڈاری۔ ہاڑوتی میں ہاڑوتی اور باگڑ میں باگڑی۔ راجستھانی زبان نے اردو زبان پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ جس کا ثبوت سترہویں صدی کی اردو شاعری سے باآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

ماہرین نے زبان کو ایک زندہ شے قرار دیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ زبان کا مطالعہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس کے تکلمی پہلو پر غور نہ کیا جائے۔ اہرین کے نزدیک چھوٹی سے چھوٹی زبان بھی، جس کا کوئی رسم الخط نہ ہو، دلچسپی کا موضوع بن سکتی ہے۔ کیوں کہ ہر زبان ایک

مکمل تہذیب وسماج کی نمائندگی کرتی ہے۔

''ڈھونڈھاری'' راجستھان کی مشہور بولی ہے۔راجستھان کی دیگر قدیم زبانوں کی خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ڈھونڈھاری مشرقی راجستھان کی نمائندہ اور سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔جس علاقے میں ڈھونڈھاری بولی جاتی ہے اس کو ڈھونڈھار کہا جاتا ہے۔ علاقے کے نام کی مناسبت سے اس کا نام ڈھونڈھاری پڑا ہے۔اس کو جے پوری بھی کہتے ہیں، کیوں کہ جے پور ڈھونڈھار کا مرکز بھی ہے اور راجدھانی بھی ہے۔۱۷۲۸ء میں جب مہاراجہ سوائی جے سنگھ نے ایک نیا شہر جے پور آباد کیا تو اس علاقے کا نا بھی جے پور مشہور ہو گیا۔اسی کی مناسبت سے یہاں کی زبان کو جے پوری ڈھونڈھاری بھی کہتے ہیں۔[۲]

زبان کی اصل پہچان اس کی بنیاد سے ہوا کرتی ہے۔یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ راجستھان میں بولی جانے والی راجستھانی اکیلی زبان نہ ہو کر کئی زبانوں کا مرکب ہے،ان زبانوں کا جو اس خطہ کے مختلف علاقوں میں صدیوں سے بولی جارہی ہیں۔پروفیسر فیروز احمد نے لکھا ہے:

> ''راجستھان میں بولی جانے والی زبان راجستھانی کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن یہ راجستھانی مختلف بولیوں کی ایسی شکل ہے جو اپنے لب ولہجہ کے اعتبار سے مختلف ہیں۔مگر ان کی اصل ایک ہی ہے۔اور یہ راجستھان کے وسیع و عریض علاقوں میں ہندی کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باوجود بول چال میں مستعمل ہے۔''[۳]

زبانیں ہمیشہ اپنے تاریخی اور سماجی تقاضوں کے زیر اثر فطری طور پر پیدا ہو کر صدیوں کے مسلسل عمل سے پروان چڑھتی ہیں۔ہندوستانی زبانوں کے دو خاص خاندانوں دراوڑی اور ہند آریائی میں سے ہند آریائی خاندان کی زبانیں پورے شمالی ہندوستان میں بولی جاتی ہیں۔ڈھونڈھاری زبان پر اردو کے اثرات کو سمجھنے کے لیے لسانی رشتوں کے حوالے سے گفتگو کرنا بہتر ہوگا۔چونکہ زبان ایک متحرک وجود ہے اور کوئی بھی زبان بلاوجہ کسی غیر زبان کے الفاظ قبول نہیں کرتی جب تک کہ ان کے درمیان ،یا ان کے بولنے والوں کے درمیان آپس میل جول نہ رہا ہو۔کسی علاقے کے باشندے جس قدر آپس میں قربت رکھتے ہیں،اتنی ہی ان

کی زبانیں بھی ملتی جلتی ہو جاتی ہیں۔انسان کے آپسی میل جول اوران کے ایک جیسے جغرافیائی حالات جہاں عام زندگی میں اشتراکیت پیدا کرتے ہیں وہیں ان کی زبانوں میں بھی مشترک اقدار پروان چڑھ کرانھیں ایک قبیلے کی شکل دیدیتے ہیں۔

ڈھونڈھاری زبان پراردو کے اثرات کو سمجھنے کے لیے مغلیہ دور کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ہوگا۔کیوں کہ پورے صوبے میں ڈھونڈھار(جے پور)ہی وہ علاقہ ہے جس نے سب سے پہلے مغلوں کی ماتحتی قبول کی۔مغل بادشاہوں سے قرابت داری اختیار کی۔دو بڑی مختلف تہذیبوں کو یکجا ہونے کا موقع ملا۔مسلم تہذیب وتمدن کے اثرات ڈھونڈھار میں صرف سرکاری طور پر ہی نہیں بلکہ عوامی طور پر بھی نظر آنے لگے۔

راجستھان کا مشہور ہندی شاعر بہاری،(۱۵۹۵۔۱۶۶۴ء) جے پور(ڈھونڈھار) راج گھرانے کا درباری شاعر تھا۔اس کے دوہوں میں اردو کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔

چُھٹن نہ پئے بیت شڑک وش نیہہ نگر یہ چال
مارے پھر پھر ماریت خونی پھرت خوس حال

یعنی جنون عشق کی یہ چال ہے کہ اس سے ایک پل بھی چھٹکارا نہیں ملتا۔مرا ہوا مر مر کے جیتا ہے اور مارنے والا(معشوق)خوش حال رہتا ہے۔اس دوہے میں خونی اور خوش حال الفاظ صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈھونڈھاری پر اردو کے اثرات دیکھنے کے لیے سب سے پہلے ڈھونڈھاری لوک گیت اور دوہوں پر گفتگو کی جائے گی۔لیکن یہ بات واضح رہے کہ ڈھونڈھاری زبان میں کبھی بھی لوک گیت کے علاوہ کسی قسم کے ادب کی تخلیق نہیں ہوئی ہے۔

مسلم تہذیب اور بول چال کا واضح اثر ڈھونڈھاری زبان پر ہوا۔ایک نہیں ہزاروں الفاظ اپنی اصل شکل کی تبدیلی کے ساتھ آج بھی ڈھونڈھاری زبان میں مستعمل ہیں۔کچھ الفاظ کی فہرست ذیل میں پیش کر رہا ہوں،جس سے دو زبانوں کے میل جول کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردو	ڈھونڈھاری	اردو	ڈھونڈھاری م

زہر	جہر	قہر	کہر
سحر	سہر	لہر	لیر
رحم	ریم	محل	میل
مہر	میر	جرمانہ	جرمانو
باغ	باگاں	قطار	کتاراں
پروانہ	پروانو	انعام	انیام
قیمت	کیمت	عقل	اکّل
خبر	کھبر	کاغذ	کاگد
علم	ایلم	معاملہ	ماملو
سیاہی	سائی	طرح	تریں
ذائقہ	جائیکو	شاباش	سیاباس
مزدور	مجور	نیلام	لیلام
اِنسان	اَنسان	مطلب	متبل

بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو معمولی ردّو بدل کے ساتھ اپنا اصل مفہوم لیتے ہوئے استعمال ہوتے رہے ہیں، جیسے

مالِک	مالَک	دفتر	دپھتر
خبر	کھبر	فرق	پھرک
معلوم	مالَم	عِلم	اِلَم

ڈھونڈھار کا مشہور ترین گیت ''ڈنگ جی جوار جی، رو گیت'' ہے۔اس گیت میں سیکر (شیخاواٹی) سے لے کر جے پور تک کے واقعات کا ذکر ہے۔اس گیت کا مرکزی کردار ڈاکو ڈونگ سنگھ ہے، جس نے انگریزوں کے خلاف اپنا محاذ کھول رکھا تھا اور وہ عوام میں ایک ہیرو کی حیثیت سے مقبول تھا۔اس گیت میں بے شمار اردو الفاظ تبدیلی اور بنا تبدیلی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔چند سطور اس گیت سے نقل کی جارہی ہیں۔

جاجم اور جاجم بچھ رہی، خوب پڑے رجواڑ

سیٹھاں لکھ پروانو بھیج یو، بڑے ساب نے دینا (پروانو۔ پروانہ۔ صاحب۔ ساب)

لوٹی مہاری لدی کتاراں، لُوٹیونو لکھ مال (کتاراں، قطار)

ڈونگ سنگھ مہارے لارے پڑیو، پکڑ کید کر لینا (کید۔ قید)

دنیا میں نام کمایو، مونڈو ہو گیو کالو (دنیا۔ نام۔ کمایا)

بھان بہنوئی کے لاگے تُو، 'دگا باج' کو سالو (بہنوئی۔ دغا باز)

درواجے کے مونڈے آگے، اڑی کھاٹ سُو کھاٹ

درواجے کی موری آگے خوب چلے تلوار (۴)

جے پور کے مہاراجہ سوائی جے سنگھ اول (۱۶۲۱۔۱۶۶۷ء) کے دور میں ایک مشہور شاعر ''بہاری'' (۱۵۹۵۔۱۶۶۳ء) بھی تھا۔ جو درباری شاعر تھا۔ اور راجستھانی (ڈھونڈھاری) کے علاوہ برج بھاشا کا بھی شاعر تھا۔ اس کی ایک راجستھانی تصنیف ''ست سئی'' بہت مشہور ہے۔ جس میں سات سو تیرہ دوہیں۔ ان دوہوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے نصف اول میں اردو کے بے شمار الفاظ علاقہ ڈھونڈھار میں استعمال کیے جاتے تھے۔

جیسے، سرتاج، فتح، سوغات، فوج، بے حال، محل وغیرہ۔

چند مثالیں ''بہاری کے دوہوں کی پیش کرتا ہوں۔

نو ناگری تنو مُلک لہی، یوون عامل زور

گھٹی بڑھتِ بڑھی گھٹِ رقم، کری اور کی اور

یعنی، یوون (جوانی) کی شکل میں (عامل) حاکم نے نو ناگری کا جسم جیسا ملک پا کر، اپنی طاقت سے گھٹنے بڑھنے والی چیز کو گھٹا ڑھا کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ جیسے کمر کو گھٹا دیا، پستان اور کولہوں کو بڑھا دیا۔ عقل کو تیز کر دیا اور انسان کی فطرت کو کچھ کا کچھ کر دیا۔۵

چند اور دوہے بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

اپنے انگ کی جانکیو ون نرپتی پروین

اِستن نینن تمب کو بڑو اضافہ لیکن

اس دوہے میں ''اضافہ'' اور ''لیکن'' الفاظ بنا کسی تبدیلی کے استعمال ہوئے ہیں۔

راجکماری نہ سور ہے مگدھا لائق بھوگ
تئو مہی پتی بجیو بھول سکل سنجوگ

اس دوہے میں ''لائق'' اپنی اصل شکل میں موجود ہے

ساماں سینا سیان کی سبھی شاہ کے ساتھ
باہو بلی جے شاہ جو فتح تہارے ہاتھ

یعنی سامان اور چالاک فوج سب دلّی کے شاہ کے ساتھ ہیں لیکن اے طاقتور جے شاہ (راجہ جے سنگھ) فتح تمہارے ہی ہاتھ پر ہوگی۔ اس دوہے میں ساماں، ساتھ، فتح، ہاتھ، شاہ۔ سب اردو کے مشہور الفاظ ہیں اور بغیر ردّو بدل کے مستعمل ہوئے ہیں۔ اب آگے کی بات کریں تو اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ڈھونڈھار میں جو شاعری کی جاتی تھی، وہ بھی ڈھونڈھاری زبان پر اردو کے اثرات کو واضح کرنے میں مستحکم ثبوت ہے۔

مہا کوی بہاری (۱۵۹۵ء۔۱۶۶۵ء) جو جے پور (ڈھونڈھار) کا درباری کوی (شاعر تھا) اس کے دوہوں اور چھندوں میں اردو کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ ذیل میں کچھ مثالیں ''گلدستہ بہاری سے دی جارہی ہیں جو ۱۹۲۵ء میں الہ آباد کے ساہتیہ سیوا سدن سے شائع ہوا تھا اور اسے منشی دیبی پرشاد پریتم نے مرتب کیا تھا۔

تجو تیر تھ، بھجو ہری، رادھیکا کا جسم نورانی
ترو ینی جن کے کیلوں سے ہے پگ پگ با آسانی
ہوا ٹھنڈی، گھنی کنج اور چھایہ لہلہاتی ہے
لبِ بحرِ جمن اب بھی وہی کیفیت آتی ہے
عبث گھیرے کھڑے شرمایئے جانے بھی گھر دیجئے
نہیں گورس کا رس، رسیا بنے گورس کا رس پیجئے (۲)

ناگری داس ناگر (۱۶۹۹ء۔۱۷۶۵ء) جے پور سے ریاست کشن گڑھ کا راجا تھا لیکن اس کو بے دخل کر یا گیا تھا، اس نے دنیاوی عیش وعشرت سے کنارا کر لیا تھا، جس کا زیادہ وقت جے

پوراور برنداون میں گزرتا تھا۔اس کے لکھے دو ہے، ریختہ اور چھند میں جو ڈھونڈھاری زبان میں ہیں،اردو کے بے شمار الفاظ موجود ہیں۔چند مثالیں پیش کر رہا ہوں۔یہ مثالیں اور نمونے'' راجپوتانہ میں اردو، ریختہ اور دوہے'' سے لیے گئے ہیں۔

ناگری داس ناگر(۱۶۹۹ء۔۱۷۶۵ء) کے مجموعے'ناگر سموچے'(۱۸۹۸ء) سے انتخاب

''ریختہ زبان کے دھرپدوں، خیالوں کی الاپ چاری میں دوہے۔''

دوہے۔

اس ہی کی سنیں صفت کوں کسی زباں میں ہوئے
قادر نادر حسن کا، کرشن کہائے سوئے
اجلے میلے خلق میں پھیلے مذہب انیک
عشق باز سرتاج کوں عشق پیارا ایک
عشق باز ویسا نہ کوؤ، ویسا صورت خوب
ناگر موہن سانولہ، قدردان محبوب
مزا مذہب جو خلق میں، سو دل کچھ نہ سُہائے
عجب اسی کے عشق کا پڑے غضب جب آئے (۷)

مہاراج پرتاپ سنگھ برج ندھی۔(۱۷۶۴ء۔۱۸۰۳ء) ریاست جے پور''برج ندھی گرنتھاولی'' (۱۹۳۳ء) سے انتخاب

ریاست جے پور کے راجہ پرتاپ سنگھ کشواہا خاندان کی سترہویں پیڑھی میں ۱۷۶۴ء میں پیدا ہوئے۔یعنی ناگری داس کی موت اور راجہ پرتاپ سنگھ کی پیدائش ایک ہی سال میں ہے۔راجہ پرتاپ سنگھ چودہ سال کی عمر میں ۱۷۷۸ء میں راج گدی پر بیٹھے۔۱۸۰۳ء میں دستوں کی بیماری سے انتقال ہوا۔ غزل کے شعر۔

جہاں کوئی درد نہ بوجھے تہاں فریاد کیا کیجے
رہا لگ جس کے دامن سے تسے کہو یاد کیا کیجے
جو محرم دل کا ہو کر کے رکھائی دے تو کیا کیجے

وہ برج ندھی کہا کر کے نہ برج رج دے تو کیا کیجے

ریختہ۔

پیارے تمہاری چال بڑی عجب انوٹھی
ہم سے بناؤ باتیں بس جھوٹی جھوٹی
ہر چند بات بنی کیسے میں ایک نہ مانوں
نج دست میں سنبھالو یہ کس کی انگوٹھی
اس شب کہاں رہے تھے سو سچ بتاؤ
لوٹی تھی خوبی کس کی پیا بھر بھر مٹھی
سن کر دیا جواب یہ ہنس برج ندھی پیارے
مجھ کو تو پیاری ایک تو ہی، کیوں اب روٹھی (۸)

مذکورہ مثالوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو نے ڈھونڈھاری زبان پر اپنے ناختم ہونے والے اثرات مرتب کیے ہیں جو آج بھی قائم ہیں۔

☆☆☆

ماخذ۔

۱۔مقدمہ، تاریخ زبان اردو۔مسعود حسین خاں۔آزاد کتاب گھر، دہلی۔۱۹۵۴ء۔ص۔۲۰
۲۔راجستھانی بھاشا شاستر۔ڈاکٹر گووند شنکر شرما۔راجستھانی ساہتیہ۔بیکانیر۔۲۰۱۱ء۔ص۔۶۷
۳۔راجستھانی اور اردو۔ڈاکٹر فیروز احمد۔گلوبل اردو کمپیوٹرس، جے پور۔۲۰۱۰ء۔ص۔۳۱
۴۔راجستھانی ماتر بھاشا گیت۔بھنور لال ناہٹا۔نیو راجستھان پریس، کلکتہ۔۱۹۵۸ء۔ص۔۲۱
۵۔کوی بہاری۔جگناتھ رتنا کار۔گرنتھ کار، بنارس۔۱۹۵۳ء
۶۔گلدستہ بہاری۔مرتبہ، منشی دیبی پرشاد پریتم۔ساہتیہ سدن، الہ آباد، سمّت۔۱۹۸۱۔
۷۔تمام دوہے اور ریختے۔راجپوتانہ میں اردو، ریختہ اور دوہے۔شاہد جمالی۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔۲۰۱۶ء۔
۸۔تمام دوہے اور ریختے۔راجپوتانہ میں اردو، ریختہ اور دوہے۔شاہد جمالی۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔۲۰۱۶ء۔

منفرد اقبال شناس: پروفیسر ایوب صابر

ضیا تسنیم

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
ڈاکٹر بی۔آر۔اے۔گرلس، پی۔جی۔کالج،
فتح پور اتر پردیش

ملخص

''برصغیر کی ایک مایہ ناز شخصیت ''علامہ اقبال'' کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔اپنی زندگی میں اقبال مشہور و مقبول ہو کر جس وقت ملک کی سرحد کو عبور کر کے عالمی سطح پر اپنی پہچان بنا رہے تھے۔ تو اسی وقت خود ان پر اپنے ملک میں سطحی و فاسق قسم کے الزام لگائے جا رہے تھے۔ایک طرف اقبال شناسی، اقبال فہمی کی طرف گامزن ہو کر اقبالیات کے نئے شعبے قائم کر رہی تھی۔تو دوسری طرف اقبال شکنی ،اقبال دشمنی کا بازار گرم تھا۔ایسے حالات میں اقبال پر لگائے گئے الزامات کو ثبوت کے ساتھ مٹانے اور منکرین اقبال کا دفاع کرنے والے کسی رہبر کی اشد ضرورت تھی۔اس نیک کام کو سرانجام دینے والا نہایت معتبر نام پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر کا ہے۔جنہوں نے اقبال پر لگائے گئے تمام الزامات کا بڑی خوب صورتی کے ساتھ دفع کیا ہے۔پروفیسر ایوب صابر (2 جنوری ۱۹۴۰ء) کا تعلق پاکستان سے ہے۔ پروفیسر ایوب صابر کی اقبال شناسی کا آغاز ۱۹۶۲ء سے ہوتا ہے۔ایم۔اے کے دوران انہوں نے بہ عنوان ''پیام اقبال کی اساس'' ایک مضمون تحریر کیا۔جو کہ مجلّہ ''کاغان'' میں شائع ہوا۔اس کے بعد ایم۔ اے فائنل میں اقبال پر ہی دوسرا مضمون ''وحدت وجود اور اقبال'' کے عنوان سے شائع کرایا۔۱۹۹۱ میں بہ عنوان ''اقبال پر معاندانہ کتب کا جائزہ'' جیسے معیاری موضوع پر ایم۔فل کا مقالہ لکھا۔اس کے بعد انہوں نے ''اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر اعتراضات'' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ چونکہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۲ء یعنی دوران طالب علمی سے ہو گیا تھا۔اس لیے تعلیم مکمل کرنے کے

بعد اس سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے تقریباً چودہ (۱۴) کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ یہاں اقبالیات سے متعلق کتابوں کا ذکر ناگزیر ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

''اقبال دشمنی ایک مطالعہ'' (۱۹۹۳)۔''معترضین اقبال'' (۲۰۰۳)۔''اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ'' (۲۰۰۳)۔''اقبال کا اردو کلام وزبان و بیان کے چند مباحث'' (۲۰۰۳)۔اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں بعنوان ''کلام اقبال پر فنی اعتراضات ایک جائزہ'' شائع ہوا۔''اقبال کی فکری تشکیل: اعتراضات اور تاویلات''۔''تصور پاکستان علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ'' ۲۰۰۴ء۔''اقبال کے فہم اسلام پر اعتراضات'' ۲۰۱۶ء۔''اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات'' ۲۰۱۸ء (تین جلدیں)۔علاوہ ازیں ''علامہ اقبال کا تصور اجتہاد'' (مجموعہ مقالات) اس کو محمد سہیل عمر کے ساتھ مرتب کیا۔اقبال شناسی کے آگے کی منزل اقبال فہمی ہے۔اور یہاں تک کم لوگ پہنچ پاتے ہیں۔کیوں کہ اس منزل تک پہنچنے میں بہت مشکل دور سے گزرنا پڑتا ہے۔پروفیسر ایوب صابر نے اس منزل کو پانے کے لیے اپنی پروفیسری کی ملازمت سے چار برس قبل سبکدوشی لے لی۔اور اس کے بعد پورے انہماک کے ساتھ اقبال پر لگ گئے۔تمام طرح کے الزامات واعتراضات کا مدلل بحث کے ساتھ مع حوالہ جواب دیا۔اقبال کے تعلق سے معترضین اقبال نے جو غلط بیانیاں کی ہیں پروفیسر ایوب صابر نے اپنی مذکورہ کتب کے ذریعہ ان تمام الزامات کا دلائل کے ساتھ دفاع کیا مثلاً اقبال کو رومان زدہ، شرابی، فکر وعمل میں تضاد کرنے والا، بے عملی کی طرف راغب کرنے والا، بداعمال اور مایوس کن انسان جیسی بے دریغ باتیں اقبال سے منسوب کرکے ان کے مرتبے کو کم کرنے کی جو ناکام کوششیں جاری تھیں پروفیسر ایوب صابر نے اپنی تحقیق وتنقید کے ذریعہ تمام مخالفین اور معترضین اقبال کی نہ صرف اصلاح کی بلکہ اقبال پر عائد تمام اتہام کا معتبر حوالوں سے دفاع کیا ہے۔

☆☆☆

یوں تو اردو ادب میں بہت سارے ادباء وشعراء پیدا ہوئے ہیں۔لیکن ہر کسی کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہوا، جو علامہ اقبال کو حاصل ہوا۔برصغیر کی ایک مایہ ناز شخصیت ''علامہ اقبال'' کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔اپنی زندگی میں اقبال مشہور ومقبول ہوکر جس وقت ملک کی سرحد کو عبور کرکے عالمی سطح پر اپنی پہچان بنا رہے تھے۔تو اسی وقت خود ان پر اپنے ملک میں سطحی وفاسق قسم کے

الزام لگائے جارہے تھے۔ایک طرف اقبال شناسی، اقبال فہمی کی طرف گامزن ہوکر اقبالیات کے نئے شعبے قائم کررہی تھی۔تو دوسری طرف اقبال شکنی، اقبال دشمنی کا بازار گرم تھا۔ایسے حالات میں اقبال پر لگائے گئے الزامات کو ثبوت کے ساتھ مٹانے اور منکرین اقبال کا دفاع کرنے والے کسی رہبر کی اشد ضرورت تھی۔اس نیک کام کو سرانجام دینے والا نہایت معتبر نام پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر کا ہے۔جنہوں نے اقبال پر لگائے گئے تمام الزامات کا بڑی خوب صورتی کے ساتھ دفع کیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر دور جدید کے قدآور محقق، ادیب اسکالر اور اقبال شناسوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔مطالعہ کرنے سے بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ''اقبال دشمنی ایک مطالعہ'' کے ذریعے سے اقبال دوستی کے دروازے میں داخل ہوکر اقبال فہمی کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔

پروفیسر ایوب صابر 2 جنوری ۱۹۴۰ء کو پاکستان کے ضلع ایبٹ آباد کے ایک گاؤں موہری میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم پاکستان کے مختلف شہروں میں ہوئی۔ ۱۹۶۳ء میں آپ نے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں بطور لکچرار تدریسی زندگی کی شروعات کی۔ پروفیسر ایوب صابر کی زندگی کا محور ''اردو زبان وادب اور اقبالیات'' ہے۔اقبالیات سے ان کے شغف کا مظاہرہ ان کے ذریعہ سرانجام دئے گئے معیاری اور معتبر کارناموں سے ہوتا ہے۔

پروفیسر ایوب صابر کی اقبال شناسی کا آغاز ۱۹۶۲ء سے ہوتا ہے۔ایم۔اے کے دوران انہوں نے بہ عنوان ''پیام اقبال کی اساس'' ایک مضمون تحریر کیا۔جو کہ مجلّہ ''کاغان'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایم۔اے فائنل میں اقبال پر ہی دوسرا مضمون ''وحدت وجود اور اقبال'' کے عنوان سے شائع کرایا۔۱۹۹۱ء میں بہ عنوان ''اقبال پر معاندانہ کتب کا جائزہ'' جیسے معیاری موضوع پر ایم فل کا مقالہ لکھا۔اس کے بعد انہوں نے ''اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔چونکہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۲ء یعنی دوران طالب علمی سے ہوگیا تھا۔اس لیے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے تقریباً چودہ (۱۴) کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔یہاں اقبالیات سے متعلق کتابوں کا ذکر ناگزیر ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

''اقبال دشمنی ایک مطالعہ'' (۱۹۹۳)۔''معترضین اقبال'' (۲۰۰۳)۔''اقبال کی

شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ'' (۲۰۰۳)۔''اقبال کا اردو کلام وزبان و بیان کے چند مباحث'' (۲۰۰۳)۔اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں بعنوان'' کلام اقبال پر فنی اعتراضات ایک جائزہ'' شائع ہوا۔''اقبال کی فکری تشکیل: اعتراضات اور تاویلات''۔''تصور پاکستان علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ'' ۲۰۰۴ء۔''اقبال کے فہم اسلام پر اعتراضات'' ۲۰۱۶ء۔''اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات'' ۲۰۱۸ء (تین جلدیں)۔علاوہ ازیں''علامہ اقبال کا تصور اجتہاد'' (مجموعہ مقالات) اس کو محمد سہیل عمر کے ساتھ مرتب کیا۔

اقبال شناسی کے آگے کی منزل اقبال فہمی ہے۔اور یہاں تک کم لوگ پہنچ پاتے ہیں۔ کیوں کہ اس منزل تک پہنچنے میں بہت مشکل دور سے گزرنا پڑتا ہے۔پروفیسر ایوب صابر نے اس منزل کو پانے کے لیے اپنی پروفیسری کی ملازمت سے چار برس قبل سبکدوشی لے لی۔اور اس کے بعد پورے انہماک کے ساتھ اقبال پر لگ گئے۔تمام طرح کے الزامات واعتراضات کا مدلل بحث کے ساتھ مع حوالہ جواب دیا اور ضرورت کے مطابق انھیں رد بھی کیا۔

اقبال پر اعتراضات کا سلسلہ طویل عرصہ پر پھیلا ہے۔کسی کو ان کے فارسی آمیز کلام سے دقت تھی تو کوئی خالص فارسی کلام سے نالاں تھا۔کسی کو ان کے یہاں قواعد کا نقص نظر آتا تھا۔تو کسی نے اقبال کی شخصیت کو ہدف ملامت بنایا۔اقبال اپنی زندگی میں تمام لوگوں کو جواب دیتے رہے۔باوجود اس کے مخالفین کا کاروبار روز بروز بڑھتا گیا۔جس کا مضر نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے اقبال شناس بھی تذبذب کا شکار ہو گئے۔لہٰذا ایسے میں کسی ایسے ماہر اقبال کی از حد ضرورت تھی۔جو کہ پوری یکسوئی اور توجہ سے اس کام کو سرانجام دے۔کام بہت مشکل ترین اور توجہ طلب تھا۔ پروفیسر ایوب صابر نے بصد خلوص اس ذمہ داری کا بیڑا اٹھانے کا فیصلہ لیا۔اور اس کام کو زندگی کے عزیز ترین لمحوں، روز وشب اور برسوں کی قربانی دے کر سرانجام دیا۔جس کے نتیجے میں آج ہمارے سامنے اقبال دشمنی اور اعتراضات کی رد میں صابر کی تقریباً نو (۹) کتابیں موجود ہیں۔

''اقبال دشمنی ایک مطالعہ'' اقبالیات پر ایوب صابری کی پہلی کتاب ہے۔یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔جس میں انھوں نے اقبال پر ہونے والے تمام اعتراضات کو رد کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔حصہ اول میں 'اقبال کی شخصیت پر معاندانہ کتب کا جائزہ لیا ہے'۔دوم میں اقبال کی

شاعری پر معاندانہ کتب اور حصہ سوم میں اقبال کے افکار پر معاندانہ کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔انھوں نے اقبال دشمنی پر مبنی کتابوں اور اقبال مخالف لٹریچر کی چھان بین کر کے اقبال دشمنی کے محرکات، رجحانات اور رویوں کا وسیع تر تناظر میں جائزہ لیا ہے۔انھوں نے اپنے ایم۔فل کے مقالے 'اقبال پر معاندانہ کتب کا جائزہ' کو نظر ثانی کرنے کے بعد ''اقبال دشمنی ایک مطالعہ'' کے عنوان سے شائع کرایا۔کتاب کے پیش لفظ میں رد اقبال میں لکھی گئی کتابوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خدوخال اقبال''میں اقبال پر اعتراضات کی بوچھار کی گئی ہے۔''علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی''میں اقبال کو ظالم اور غاصب ظاہر کیا گیا ہے۔یہ دونوں کتابیں اقبال کی شخصیت کو منہدم کرنے والی ہیں۔''اقبال کا شاعرانہ زوال''میں اس طرح کے اعتراضات جمع ہو گئے ہیں۔جو اہل زبان حضرات عام طور پر کیا کرتے تھے۔ مثنوی ''سرالاسرار'' اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کی تردید میں لکھی گئی ہے۔یہ روایتی عجمی تصوف کی ترجمان ہے۔مجنوں گورکھپوری کی کتاب 'اقبال کا اجمالی تبصرہ' اشتراکی اہل قلم کی نمائندگی کرتی ہے۔بعض اشتراکیوں نے عجیب وغریب انداز سے اقبال کو منہدم کرنا چاہا ہے۔ان میں علی عباس جلال پوری اور صائب عاصمی شامل ہیں۔صائب عاصمی نے ''اقبال قلندر نہیں تھا'' میں اقبال کو معزول کر کے قلندر کے مقام پر کارل مارکس کو فائز کیا ہے۔مکائد اقبال، خارمانہ تبدیلیاں اور 'مودبانہ تبدیلیاں' کتابچے ہیں۔ان کا مختصر جائزہ اس لیے شامل کیا ہے۔تاکہ ایک تنگ نظر اور فرقہ پرست مولوی کا پورا کام سامنے آجائے۔'' (۱)

پروفیسر صابر ایوب نے مذہبی فرقہ وارانہ تعصب رکھنے والے، سیاسی، نظریاتی، مخالفین، علاقائی اور انسانی تعصب رکھنے والے لوگوں کو اقبال دشمن کہا ہے۔اور ان کو شمشیر بے نیام بن کر دندان شکن جواب دیا ہے۔مخالفین اقبال کی باتوں کو رد کرنے والے اقبال شناسوں کو سراہتے ہوئے پروفیسر ایوب صابر ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

> ''اس ضمن میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور پروفیسر عبدالمغنی کی کاوشیں خاص طور پر اہم اور قابل تحسین ہیں۔اسلوب صاحب کے اپنے مضامین اور

ان کے علمی مجلّے ''نقد ونظر'' نے بھارت میں تنقید اقبال کی راست روی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ موخر الذکر نے تو کلیم الدین احمد کے جواب میں پوری کتاب لکھ کر گویا دفاع اقبال کا حق ادا کر دیا ہے۔'' (۲)

اقبال کی ذات اور ان کے کلام پر جو اتہام باندھے گئے، جس طرح ان کا تمسخر اڑایا گیا ان کے سبب پروفیسر ایوب صابر نے ذاتی طور پر ذہنی اور روحانی کرب کو محسوس کیا۔ ان کی شفاف ذہنیت اور وضع داری سے یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ خاموش رہ جاتے۔ لیکن معاندانہ اقبال کا دفاع کرنا جتنا ضروری تھا، اتنا ہی وقت اور توجہ طلب بھی تھا۔ اگر انسان میں عزم و حوصلہ ہو تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اعتراضات کا رد کرنا گویا کسی سے دشمنی مول لینا ہو۔ اس لیے واقعی یہ کام مشکل تھا لیکن پروفیسر ایوب صابر نے اعتراضات اقبال پر مبنی پورا لٹریچر کھنگال کر اس کی بکھیا بھی ادھیڑ دی۔ ایک دو نہیں بلکہ پوری نو کتابیں لکھ کر ثابت کر دیا کہ کوئی بھی کام ناممکن نہیں۔

اقبال پر اعتراضات کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کہ بڑے بڑے اقبال شناس بھی متاثر ہونے لگے تھے۔ پروفیسر ایوب صابر نے اس ضمن میں بے باک قلم کاری کی اور مخالفین کے دماغ درست کیے۔ ان کی اس کاوش نے اقبال مخالفین کو کٹگھرے میں لا کھڑا کیا۔ جس کے سبب معتبر اقبال شناسوں کا اقبال کے متعلق کانسپٹ کلیئر ہوا۔ ''تنقید زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی کہ سانس'' نقوی، پروفیسر نورالحسن (2019) فن تنقید اور اردو تنقید نگاری۔ ص:8، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے انداز میں اگر کہا جائے کہ ''معترضین اقبال کی رد کرنا اتنا ہی ناگزیر ہے جتنی کہ سانس'' تو بے جا نہ ہوگا۔ معترضین اقبال کے متعلق پروفیسر ایوب صابر نے جو نکتہ اخذ کیا ہے وہ اس طرح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال پر لکھنے والے ان کے ارادت مند مخالفین اقبال کی مہم جوئی سے اثر قبول کرتے رہے ہیں، چنانچہ بعض غلط فہمیاں اقبالیات کے طلبہ ہی میں نہیں اساتذہ میں بھی عام ہیں۔ اور بعض ''معتبر اقبال شناس'' بھی ان کا شکار ہیں۔ اگرچہ مخالفین اقبال میں سے جو شدت پسند ہیں وہ تلملا کر ردِ عمل ظاہر کریں گے۔ لیکن ان کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ اور امید کی جا سکتی ہے کہ علامہ اقبال پر لکھنے والے آئندہ مخالفین اقبال کے پروپیگنڈے سے متاثر نہیں

ہوں گے۔ ماہرین اقبال ہی اگر اقبال کی عمدہ واعلیٰ شخصیت کا ادراک اور فکر اقبال کی صحت وعظمت پر اعتماد نہیں کریں گے۔ تو اقبال کی انسانی بصیرت کیوں کر بروئے کار آئے گی''(۳)

واقعی پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ انھوں نے معتبر حوالوں کے ساتھ دودھ سے پانی الگ کر دیا ہے۔ اقبال کی شخصیت کے آگے مخالفین اقبال بونے نظر آتے ہیں۔ ان کے کارنامے کے سبب مخالفین اقبال اپنی خطا پر نادم بھی ہوں گے اور سامنا کرنے سے گریز بھی کریں گے۔ پروفیسر ایوب صابر کے قلم نے اقبال کی شخصی، فکری فنّی خصوصیات کو واضح کر کے انہیں مزید معتبر اور مستند بنا دیا ہے۔

پروفیسر ایوب صابر نے اس کتاب میں اہل زبان، روایتی عجمی تصوف کے حامی، مستشرقین، ہندی قوم پرست مسلمان، تنگ نظر اور فرقہ پرست مولوی، اشتراکی اور دہریے، حاسدین، قادیانی، قدیمی اور جدیدی ا، ور متفرق عناوین کے تحت معترضین اقبال کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ساتھ ہی حسب ضرورت ان کے اعتراضات پر ردعمل ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ پر پروفیسر ایوب صابر اقبال کے تصور تصوف کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''تصوف تعلیمات اقبال میں رچا بسا ہے۔ لیکن آنکھیں بند کر کے، تصوف میں شامل غیر اسلامی عناصر کو وہ صرف قبول ہی نہیں کرتے بلکہ عملی استدلال سے ان کی تردید کرتے ہیں۔۔۔ اقبال ایسے تصوف کے خلاف ہیں جو عوام کی قوت عمل کو ضعف کرتا ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کرتا ہے اور عوام کو توہمات میں مبتلا کرتا ہے۔ ان کی فقر کا سفینہ ''طوفانی'' ہے۔ وہ ''سوز مشتاقی'' چاہتے ہیں نہ کہ ''فسانہ ہائے کرامات۔'' (۴)

پروفیسر ایوب صابر کی تنقید گہرا تحقیقی پہلو لیے ہوتی ہے۔ وہ جس موضوع پر بحث کرتے ہیں۔ اس کی تہہ در تہہ کھولتے ہوئے حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تصوف کے تعلق سے اقبال کے نظریہ سے آپ نے بالکل درست نتائج نکالیں ہیں۔ کلام اقبال کی ورق گردانی کرنے پر کہیں بھی بے عمل ہونے کی تعلیم نہیں ملتی۔

پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر نے اپنی کتاب ''اقبال کے فہم اسلام پر اعتراضات''، میں خطبات پر اعتراضات، تصور اجتہاد پر اعتراضات، جمہوریت کے ضمن میں اعتراضات، غیر اسلامی عقائد رجحانات کا الزام، معرکۂ اسرار خودی جیسے اہم موضوع پر لکھ کر اقبال فہمی کی قابل تحسین مثال پیش کی ہے۔

پروفیسر ایوب صابر نے اقبال پر مخالفین کے ذریعہ باندھے گئے ہر اتہام کا دفاع کیا۔ انہوں نے اس کام کے لیے اپنی زندگی کے اہم ترین لمحات کو اقبال شناسی کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے اقبال پر ایک ضخیم کتاب بعنوان 'اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات ایک مطالعہ'' ۲۰۱۸ء میں لکھی۔ اس کام کے لیے ملازمت سے قبل از وقت استعفا دے کر کتاب کی تصنیف کے لیے کام شروع کیا۔ یہ ان کی اقبال سے شدید لگاؤ کی مثال ہے۔ تقریباً 20 برس کی محنت شاقہ کے بعد کتاب مکمل ہوئی۔ مذکورہ کتاب ۲۰۳۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جتنی ضخیم ہے اتنی ہی معتبر اور قابل داد ہے۔ اس میں مصنف نے اقبال کے اعتراضات کے حوالے سے کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ جو بھی موضوع اٹھایا اس کے اصل تک پہنچ کر قارئین کو حقیقت سے روشناس کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔

''اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات: ایک مطالعہ'' جلد اول گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں پروفیسر ایوب صابر نے اہل زبان، روایتی عجمی تصوف کے حامی، مستشرقین، مسلکی شدت پسند مولوی، اشتراکی اور دہریے، حاسدین اور طالبان شہرت، قادیانی، قدامت پرست اور مغرب پرست وغیرہ عناوین کے ضمن میں تنقید اقبال کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ یوں تو اقبال پر متعدد معیاری تحقیقی وتنقیدی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن پروفیسر ایوب صابر کی مذکورہ کتاب ثانی نہیں رکھتی۔ پروفیسر ایوب صابر ایک جگہ پر مقام اقبال کا تعین کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''عصر حاضر میں اقبال کا مقام منفرد اور بہت بلند ہے۔ جن افراد اور گروہوں نے اقبال کو منہدم کرنے پر ذہنی توانائی صرف کی ہیں انھوں نے نہ صرف اپنے وقت اور اپنے دل ودماغ کو ضائع کیا بلکہ انسانیت کی بھی کوئی خدمت نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حقیقی انسانی اقدار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کے مرتکب ہوئے ہیں۔''(۵)

واقعی اقبال مشرق کا وہ بلند ستارہ ہے۔جس کی چمک مغرب تک پہنچی مخالفین اقبال ان کی چمک کو منہدم کرنا چاہتے تھے۔لیکن پروفیسر ایوب صابر جیسے اقبال فہم یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے؟ آخر انھوں نے مخالفین و معترضین کا بے باکی سے جواب دے کر ان تمام کے تمام کا دفاع کر کے مشرق کے ستارے کو مزید چمک دار بنا دیا۔انھوں نے اقبال پر عائد تمام الزامات کو مدلل بحث کے ساتھ رد کیا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جتنی بڑی شخصیت ہوتی ہے۔امتحان بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں ایسا ہی کچھ اقبال کے ساتھ ہوا۔ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے۔ان کے خاندان و نسل پر انگشت نمائی کی گئی۔انھیں شرابی،عشق باز،انگریزوں کا آلۂ کار،قوم پرست،وطن بیزار اور قول و فعل میں تضاد کرنے والا جیسے غیر مہذب الزامات لگائے گئے۔جن کا پروفیسر ایوب صابر نے مدلل بحث کے ساتھ ابطال کیا ہے۔اقبال شکنی کا کام تسلسل سے جاری رہا۔نتیجتاً بڑے بڑے اقبال دوست پر بھی اس کا مضر اثر پڑا۔اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اقبال نشہ آور منشیات کا شوق رکھتے تھے۔اقبال پر شراب نوشی کا الزام لگانے والوں کو جواب دیتے ہوئے کئی واقعات اور احباب کی آرا کو بروے کار لاتے ہوئے پروفیسر ایوب صابر لکھتے ہیں:

''جو صاحبان شراب پیتے ہیں،ان کے بارے میں پکے ثبوت اور وافر شواہد مل جاتے ہیں۔غالب، فیض اور جوش کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔علامہ اقبال کے بارے میں نہ صرف یہ کہ کوئی ثبوت نہیں ملتا۔بلکہ واقفانِ حال اور ان کے احباب نے اس الزام کی صاف صاف تردید کی ہے۔مولوی احمد دین اور نواب ذوالفقار علی خاں نے اقبال پر جو کچھ لکھا ہے۔اس میں شراب نوشی کا ذکر نہیں۔ سردار امراؤ سنگھ ٹیر گل اور خواجہ عبدالوحید شراب نوشی کے الزام کی تردید کرتے ہیں۔اقبال کی ایک بھتیجی کا حلفیہ بیاں ہے کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے۔ان کے مشاہدے میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا جس سے یہ شبہ ہو سکتا کہ اقبال شراب کا شوق کرتے تھے۔شیخ اعجاز لکھتے ہیں:

''میں اپنے علم اور مشاہدے کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اقبال پر مے نوشی کا الزام ایک بہتان ہے۔''(۶)

درج بالا حوالوں کے علاوہ اس سے متعلق پروفیسر ایوب صابر مزید شواہد دیتے ہوئے حجاب امتیاز علی تاج کا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں۔جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال شراب

نوشی نہیں کرتے تھے۔ واقعہ کچھ اس طرح ہے۔ اپنے خطبات کے سلسلے میں علامہ اقبال مدراس گئے تھے۔ وہاں ان کا سب سے بڑے ہوٹل میں استقبال کیا گیا۔ ملک اور بیرون ملک کی بڑی ہستیاں موجود تھیں۔ شراب پیش کی گئی جس پر علامہ اقبال نے کہا کہ میں بالکل نہیں پیتا۔ میں نے کبھی انگلستان میں بھی شراب نہیں لی۔ یہ سن کر آس پاس بیٹھے لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

مذکورہ تمام ثبوتوں کے بعد شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اور یہ ثبوت اس بات کے ضامن ہیں۔ کہ اقبال نے کبھی شراب نہیں پی۔ اقبال کے شراب نہ پینے کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ تلاوت قرآن کرتے وقت زاروقطار رویا کرتے تھے۔ ان کے آنسوؤں سے تر قرآن آج بھی محفوظ ہے۔ ایک معمولی سے معمولی انسان بھی وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ جس کے اندر خوف خدا اتنی شدّت سے ہو وہ اللہ کی حکم عدولی کبھی نہیں کر سکتا ہے۔

عبدالمجید سالک کی کتاب 'ذکر اقبال' اقبالیاتی ادب میں اہمیت کی حامل ہے۔ باوجود اس کے انھوں نے اقبال پر فرضی قصے گڑھ کر کئی طرح کے الزام لگائے ہیں۔ مخالفین اقبال نے تو اقبال شکنی میں ہر وہ دعویٰ کیا۔ جو حقائق کے برخلاف تھا۔ اقبال کو رومان زدہ، ان کی فکر وعمل میں تضاد، بے عملی کی طرف راغب کرنے والا، بداعمال اور مایوس کن انسان جیسی بے دریغ باتیں اقبال سے منسوب کی ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تباہ حال، مایوس اور پستی کی طرف گامزن قوم کے دل ودماغ میں یقین وامید کی روشنی پیدا کرنے کے لیے اقبال نے زندگی کے آخری سانس تک قوم کی خدمت کی۔ بیماری کے باوجود، قوم اور نسل انسانی کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے آخری دنوں کی نظم حضرت انسان اس بات کی ضامن ہے۔ آپ خود اندازہ لگائیں ایسا انسان مایوسی کا شکار کیسے ہوسکتا ہے؟ لہذا یہ کہنا کہ ان پر ناامیدی کا گہرا سایہ تھا محض غلط بیانی ہے۔

اقبال کو جب سر کا خطاب ملا تو اس کی پرزور مخالفت کی گئی۔ عبدل المجید سالک نے تو باقاعدہ مخالفت میں ایک نظم لکھی۔ جو کہ رسالہ 'زمیندار' میں شائع ہوئی۔ حالانکہ خطاب قبول کرنا وقت کی نزاکت اور سیاسی رخ کے پیش نظر درست فیصلہ تھا۔ جو کہ اقبال کی فہم وذکاوت کا ضامن ہے۔

اقبال کے مخالفین میں سردار عبدالقیوم، اقبال سنگ، کے۔ ایل۔ گابا، ڈاکٹر سچانند سنہا، ڈاکٹر رستوگی، عبدالمجید سالک اور تنگ نظر مولوی کا کردار پیش پیش رہا ہے۔ پروفیسر ایوب صابر نے

پورے وثوق اور صبر کے ساتھ سب کو درجہ بہ درجہ جوابات دے کر ان کا دفاع کیا۔ اقبال پر قوم پرست ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اور ان کی نظم ''ترانۂ ملی'' کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔ جس کے رد میں پروفیسر ایوب صابر یوں رقم طراز ہیں:

> ''اقبال مشرق و مغرب کی شب کو سحر کرنے کے آرزومند ہیں۔ مشرق میں عالم اسلام کے ساتھ ہی اقبال کی نظر ہندوستان پر پڑتی ہے کہ ہند سامراج کا زخم خوردہ تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو جگانا اور آزادی سے ہم کنار دیکھنا چاہتے ہیں۔''(۷)

درحقیقت اقبال جیسا سیکولر مزاج اور تعصب سے پاک شاعر تاریخ کی ورق گردانی کرنے پر شاذ و نادر ہی نظر آئے گا۔ نظم، ہمالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور نانک جیسی مشہور زمانہ نظمیں لکھنا اقبال کا کمال ہے۔

اقبال پر قوائد و زبان کے تعلق سے جو اعتراضات کیے گئے۔ اس کے متعلق پروفیسر ایوب صابر کئی شعراء کی مثال دے کر اقبال کے مقام کا تعین کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''اقبال نے نئی تراکیب، نئے محاورے، نئی تلمیحات، نئے اشارات نئی علامات اور نئی اصطلاحات وضع کی ہیں ان سے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح تذکیر و تانیث کے ضمن میں دہلی و لکھنؤ کا فرق و اختلاف معلوم و معروف ہے۔ چنانچہ کسی ایک دبستان کی پیروی کے بجائے اقبال اپنے ذوق کے مطابق ''غار'' یا ''پرہیز'' کو مؤنث کے طور پر لیں، تو اس پر معترض ہونا ناروا ہے۔ انیس نے بلبل کو مذکر باندھا ہے۔ اور غالب و اقبال کے ہاں یہ لفظ مؤنث ہے۔۔۔ سب سے زیادہ اہمیت میرؔ، غالب اور اقبالؔ کو ملنی چاہئے۔ جو شاعر جتنا بڑا ہوتا ہے۔ زبان پر اس کے اثرات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا ہے کہ شیکسپیئر اور غالب کا کام قواعد و زبان کی پابندی نہیں ہے۔۔۔۔ یہ ایک صائب رائے ہے۔ اور اس کا اطلاق اقبال پر بھی ہوتا ہے۔''(۸)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''سیماب اکبرآبادی اور عبدالسلام ندوی نے ''پرہیز'' کی تانیث پر اعتراض کیا ہے۔ سیماب کے نزدیک ''فکر'' مؤنث ہے اور ''غار'' مذکر، جب کہ بقول اثر لکھنوی دہلی والے فکر اور سانس کو مذکر بولتے ہیں۔ نورالغات کے مطابق ''غور'' لکھنؤ میں مذکر اور دہلی میں مؤنث ہے۔ مزید برآں جن اشعار میں ''غور'' اور ''نقد'' کو اقبال نے مؤنث استعمال کیا ہے۔ وہ منسوخ کر دئے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند کے اپنے بیاں کردہ اصول کے مطابق منسوخ اشعار پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔''(۹)

ہر ذی شعور پروفیسر ایوب صابر کی اس رائے سے اتفاق کرے گا۔ دراصل شاعری نام ہے آہنگ کا شاعر کا کمال یہ نہیں کہ وہ قواعد کا ماہر ہو۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ وہ کتنی بلند فکر رکھتا ہے؟ اقبال نہ صرف شاعر ہیں بلکہ بڑے شاعر ہیں۔ ان کی فکر کی بلندی نے انھیں عالمی سطح پر مشہور و معروف کیا۔ قوم کو راہ راست پر لانے میں ان کا کردار کلیدی رہا ہے۔

اقبال ایسی شخصیت کا نام ہے۔ جن پر غیر جانبدارانہ انداز سے تحقیق وتنقید کی جائے۔ تو وہ عالمی سطح پر بڑے شاعر و مفکر کی صف میں کھڑے دیکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر ایوب صابر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے یکسوئی اور غیر جانبدارانہ انداز سے اقبال پر تحقیق وتنقید کی۔ انہوں نے ہر اس شخص کی باتوں کا دندان شکن جواب دیا جنہوں نے اقبال پر فاسق اتہام باندھے تھے۔ پروفیسر ایوب صابر نے اقبال کے صاحب زادے آفتاب اقبال کو بھی نہیں بخشہ، اتنا ہی نہیں اقبال شناس کے زمرے میں شمار کیے جانے والے فرزند اقبال، ڈاکٹر جاوید اقبال کی بات جہاں انہیں غلط لگی تو انہیں بھی معاف نہیں کیا۔ انہوں نے نہ صرف معترضین ومخالفین اقبال کی تردید کی۔ بلکہ ایسے اقبال شناسوں کی اصلاح کی جو مخالفین کے ہاتھوں غلط فہمی کا شکار تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر کے متعلق اردو اکادمی کے ڈائریکٹر جنرل، ڈاکٹر راشد حمید یوں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر ایوب صابر نے تحقیق میں جواب کے بجائے تجربہ اور تحلیل سے کام لیا۔ اور اس میدان میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر ایوب صابر اقبال کے دفاع میں شمشیر برہنہ ہیں۔ لیکن جوش عقیدت میں دانائی اور بینائی کے ساتھ اقبال دشمنوں کو دلیل کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔''(۱۰)

اقبال پر لگنے والے الزامات کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔لیکن ڈاکٹر ایوب صابر کی اقبال شناسی وقتی نہیں بلکہ فکر اقبال کے ساتھ انہوں نے زندگی کا لمبا عرصہ گزارا۔وہ شاہراہ اقبال کے ایسے شمشیر بے نیام سپاہی ہیں۔جنہوں نے اقبال پر عائد شدہ ہر اتہام کا تحقیقی جائزہ غیر جانبدارانہ انداز میں لیا۔سر اقبال کی ذات وشخصیت،فکر وفن،فلسفہ ونظریات اور شاعری کے حوالے سے کوئی بھی بہتان ایسا نہیں بچتا جو کہ پروفیسر ایوب صابر کے قلم کی زد میں نہ آیا ہو۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر ایوب صابر کی اقبال فہمی اور ان کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اڑائے جانے والے چھینٹے، پروفیسر ایوب صابر کے لیے ذہنی اذیت اور کرب کا باعث تھے۔ان کی نفاست طبع اور وضع داری سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ تنقید اقبال کی اس پھوہڑ پن اور بدہیئتی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتے ہوئے اس پر خاموش رہتے،مگر مخالفین کا جواب دینا جس قدر ضروری تھا۔ اتنا ہی مشکل بھی تھا۔۔۔باعث اطمینان یہ ہے کہ مشکل مرحلے کو جو ایک طرح سے عام مقام عشق بھی ہے،ایوب صابر نے بڑی جرأت اور فرزانگی سے طے کیا ہے۔امید ہے کہ جناب ایوب صابر اپنے جائزے کو توسیع دیتے ہوئے پورے اقبال مخالف لٹریچر کو کھنگالیں گے،اور اس کی فکری گمراہیوں کی نشاندہی کے ساتھ، اس کے نفسیاتی محرکات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔''(۱۱)

امید و یقین ہے کہ پروفیسر ایوب صابر کی اقبال فہمی، اقبالیات سے تعلق رکھنے والے ناقدین میں ذہنی طور پر تغیر لائے گی۔ پروفیسر ایوب صابر شناسان اقبال کے لیے ایک طرف شجر سایہ دار ہیں۔تو دوسری طرف مخالفین اقبال کے لیے شمشیر بے نیام سپاہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ایوب صابر کی تحقیق کو معتبر اور معیاری تصور کرتے ہوئے یقیناً مخالفین اقبال بھی اقبال کے متعلق پیش کیے گئے شواہد و دلائل سے اتفاق کریں گے۔اور آئندہ اقبال پر غلط بیانی کرنے سے اجتناب کریں گے۔جس سے اقبالیات کے ضمن میں خوش گوار فضا قائم ہو سکے گی۔

☆☆☆

حوالہ:

۱)۔صابر، پروفیسر ایوب،۲۰۰۴ء،معترضین اقبال،نئی دلی:انٹرنیشنل بک ہاؤس۔ص ۵
۲)۔صابر، پروفیسر ایوب،طبع اول ۱۹۹۳ء اقبال دشمنی ایک مطالعہ لاہور جنگ پبلشرز ص:۵
۳)۔صابر، پروفیسر ایوب،۲۰۰۴ء۔معترضین اقبال،نئی دہلی:انٹرنیشنل بک ہاؤس،ص ۱۹
۴)۔صابر، پروفیسر ایوب۔۲۰۰۴ء۔معترضین اقبال،نئی دہلی:انٹرنیشنل بک ہاؤس،ص ۱۴
۵)۔صابر، پروفیسر ایوب ۲۰۱۸ء۔اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات ایک مطالعہ۔جلد اول۔ص،۳۰
۶)۔صابر، پروفیسر ایوب ۲۰۱۸ء۔اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات ایک مطالعہ جلد اول)لاہور ص:۹
۷)۔صابر، پروفیسر ایوب ۲۰۱۸ء اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات ایک مطالعہ جلد دوم۔ص ۴۷)
۸)۔صابر، پروفیسر ایوب،۲۰۱۸ء۔اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات:ایک مطالعہ جلد سوم ص:۱۵۹۶
۹)۔صابر، پروفیسر ایوب،۲۰۱۸ء۔اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات:ایک مطالعہ،جلد سوم ص:۱۵۹۷
۱۰)۔صابر، پروفیسر ایوب،۲۰۱۸ء۔اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اعتراضات:ایک مطالعہ جلد سوم ص:۱۷۵۴
۱۱)۔صابر، پروفیسر ایوب،(طبع اول:۱۹۹۳ء۔اقبال دشمنی ایک مطالعہ،۔ص ۱۷)

ناصر ملک: رنگین دنیا کا ایک گمنام شاعر

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا
شعبہ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی

ملخص

اردو ادب ہر دور میں نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے۔ لیکن ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اس کے لیے نت نئی راہیں ہموار کی ہیں اور ترقی کے راستے پر اسے گامزن کرتے رہے ہیں۔ ناصر ملک میں شاید ایک بات تھی کہ جس نے ان میں اوائل طالب علمی سے ہی ہر شئے کو غور سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ ناصر ملک کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری زندگی کے ہمہ جہت مسائل آرزوں، امنگیں اور احساس و جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ موجودہ دور میں وہ ایک عظیم شاعر و فنکار کی حیثیت سے ہماری اردو کی میراث کا حصہ ہے اور مسلسل اردو شعر و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ عالمی ادب کے اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے پر ان کی شاعری کو پرکھیں تو وہ اس میں کھڑی اتریں گی۔

☆☆☆

ہر دور کا ادب اپنے عہد کی تہذیب اور زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور اپنے دور کی عصری حیثیت کو پیش کرتا ہے جس کا اظہار کم و بیش زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس حقیقت کو وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو ادب برائے ادب کے قائل ہیں اور اس کا رشتہ ذہن اور زندگی سے زیادہ کتاب اور لغت سے جوڑنا چاہتے ہیں بقول ڈاکٹر محمد حسن ''انفرادی ذہن بھی بالآخر سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور وہ ادیب بھی جو اپنی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں دراصل زندگی ہی کے عکاس ٹھہرتے ہیں۔'' ادب انسانی جمالیات اور اس کے فنی شعور و صلاحیت کا مکمل مظہر و عکاس ہوتا ہے۔ انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ فنی شہہ پارے کے مطالعہ کے ذریعہ خود کو سنوارے اور لوگ اس کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھیں۔

کسی ملک کی تاریخ میں تہذیب سے ہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی، کس حد تک اس میں اخذ وقبول کی صلاحیت تھی اور کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی سکت یا قوت تھی۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے مختلف تہذیبی دھاروں سے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے اور ہزاروں برس کی اقوام عالم کی تاریخ میں اگر آج ہندوستان زندہ ہے تو اس کا سبب اسکے مختلف علاقوں کے تہذیبی دھارے تھے جو ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود مشترکہ عناصر بھی رکھتے تھے۔ ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ تھے مگر سب مل کر ایک رنگ تھا جسے ہندوستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی وجود میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مگر سب ایک ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔ سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتا ہے مگر بہر حال وہ ایک ہوتا ہے۔

اردو ادب ہر دور میں نشیب وفراز سے گزرتا رہا ہے۔ لیکن ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اس کے لیے نت نئی راہیں ہموار کی ہیں اور ترقی کے راستے پر اسے گامزن کرتے رہے ہیں۔ ناصر ملک میں شاید ایک بات تھی کہ جس نے ان میں اوائل طالب علمی سے ہی ہر شئے کو غور سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ غور وفکر اور ذہنی ورزشیں اوائل عمری سے ہی ان کے اندر موجود تھیں۔ تجسس کے جذبے نے انہیں آج اس مقام پر پہنچا دیا کہ ہندو وپاک میں ان کی شہرت اور ان کے چرچے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اردو ادب کے کونے کھدروں میں جھانک جھانک کر ان کا مطالعہ کیا۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری زبان کا دامن جتنا وسیع ہے اس کے تمام گوشوں پر نظر ڈالنے کی صلاحیت کسی ایک طالب علم میں نہیں ہوسکتی لیکن یہ بھی یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ناصر ملک اپنا فرض پوری ایمانداری سے ادا کرنا جانتے ہیں۔ اور مضامین قلم بند کرتے وقت انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ انہیں قطعی یہ دعویٰ نہیں کہ ان کے یہ مضامین اپنے موضوع کو پوری طرح واضح کر سکتے ہیں لیکن اگر میرے مضامین کے ذریعہ کسی اہم موضوع کی نشاندہی بھی ہوجائے تو میرے لیے یہ بات باعث تسکین ہوگی۔ ایک زمانہ تھا اردو شعر وادب کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اردو شاعری میں گل وبلبل اور لب ورخسار کی باتیں ہی قلمبند کی جاتی ہیں۔ اسی طرح اردو ادب عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن حالیہ برسوں میں اس سلسلے میں غیر معمولی تبدیلیاں آئی ہیں اور اب اردو شعر وادب میں زندگی کے سلگتے مسائل سے بھی بحث کی جارہی ہے۔ اس دور کے ادب کا مطالعہ کرتے

وقت ہماری جن ادیبوں اور شاعروں میں جاتی ہے ان میں ناصر ملک سرفہرست ہیں۔

ناصر ملک ایک روشن خیال ادیب معروف افسانہ نگار، تاریخ داں، محقق اور میٹھے لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کا نام بہت طویل عرصہ قبل تحقیقی ادب اور شاعری کے حوالے سے سامنے آیا تھا۔ انہوں نے کئی شاہکار تخلیق کیے اور اپنی نثر نگاری، ناول نگاری، شاعری اور صحافتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے لفظوں سے ایسی خوبصورت تحریروں کو ادب کا حصہ بنایا کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں میں انہیں انفرادی مقام حاصل ہو گیا۔

ناصر ملک 15 اپریل 1972ء کو چوک اعظم (ضلع لیہ) میں پیدا ہوئے۔ 1987ء میں میٹرک کا امتحان اعزازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ 1989ء تک گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان میں زیرِ تعلیم رہے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد گورنمنٹ ہیلتھ ٹیکنشن کالج ڈیرہ غازیخان میں داخلہ لیا اور 1991ء میں پنجاب میڈیکل فیکلٹی ٹاپ کرتے ہوئے کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ گریجویشن اور ایم اے (اسلامیات) کرنے کے بعد سلسلہ تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ ناصر ملک کے تعلیمی سفر پر اگر ہم نظر ڈالیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی ذہین و فطین تھے اور اپنے ہم جماعت طلبا سے ہمیشہ ممتاز رہے۔ دورانِ تعلیم ان کا شمار اچھے اور باذوق طلباء میں کیا جاتا تھا۔

ان کے ادبی سفر کا آغاز 1985ء میں ہوا۔ بچوں کے ایک ماہنامہ میں پہلی کہانی شائع ہوئی جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پھر دوسرے بڑے اور اہم رسالوں میں ان کے افسانہ شائع ہونے لگے اور یہ سلسلہ قومی اخبارات تک پھیلتا چلا گیا۔ 1986ء میں لاہور کے ایک ادبی جریدے ''آداب عرض'' نے ان کی فنی و تخلیقی صلاحیتوں کو بے حد نکھارا۔ ابتدائی مراحل میں ہی ان کے معاشرتی ناول ''سحر'' نے ان کو ملکی سطح پر روشناس کرا دیا اور مسلسل آج تک ناصر ملک آب تاب کے ساتھ اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ ناصر ملک ایک ہی وقت میں ادب کی کئی اصناف میں کام کرتے ہیں اور یقیناً ان کو ہر صنف میں غیر معمولی دسترس بھی حاصل ہے۔ ناصر ملک کا تصنیفی سرمایہ بہت کثیر ہے۔ ان کا شمار موجودہ دور کے کثیر التصانیف ادبا میں ہوتا ہے۔

1993 میں ان کی یادداشت پر مشتمل پہلی انگریزی کتاب Golden Memories شائع ہوئی۔ 1993ء میں ان کا اردو ناول ''پتھر'' کتابی صورت میں شائع ہوا۔

1995ء میں ان کے شاعرانہ افکار پر مبنی پہلی اردو کتاب ''یہ سوچ لینا'' شائع ہوئی۔ 1996ء میں انہوں نے اَدبی میگزین ''شاہکار'' کا ماہ بہ ماہ اجراء کیا جو سال بھر تسلسل کے ساتھ شائع ہوا اور پھر مالی وسائل کی کمی کے باعث تعطل کا شکار ہو گیا۔ 2002ء میں ان کی تاریخی تحقیق پر مبنی ضخیم کتاب ''انسائیکلو پیڈیا آف لیہ'' شائع ہوئی۔ 2003ء میں انہوں نے پنجابی اَدبی بورڈ لاہور کے لیے اپنی مادری زبان پنجابی میں ''لیہ دی تاریخ'' لکھی جو کسی وجہ سے شائع نہ ہو پائی۔ حالیہ دِنوں میں اِسی کتاب کو لہراں اَدبی بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے جو تاریخ کے وسیع اور دقیق میدان میں اپنی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ 2008ء میں ان کا مجموعہ کلام ''غبارِ ہجراں'' شائع ہوا جس نے ملکی سطح پر بہت پذیرائی حاصل کی۔ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ''جان، جگنو اور جزیرہ'' منظر عام پر آ چکا ہے۔ ان کی ایک کتاب ''لیمپ والی لڑکی'' جس میں فلورنس نائٹنگیل (جدید نرسنگ کی بانی) کی سیر حاصل بائیوگرافی دی گئی ہے۔ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

ناصر ملک کی گھریلو مالی حالت بہت بہتر نہیں رہی۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد، ملک محمد بخش، محکمہ جنگلات میں بہ طور فاریسٹر ملازم تھے۔ وہ چونکہ نہائت مذہبی اور شرعی طرزِ زندگی گزارتے تھے، اِس لیے گھر میں محض تنخواہ کی رقم ہی آیا کرتی تھی جو اتنی مضبوط ہرگز نہیں تھی کہ حلقۂ امارت میں شامل کرتی۔ ان کے بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ والد صاحب نے ملازمت کے سلسلے میں 1965ء میں سرگودھا سے نقل مکانی کی اور تھل کے دِل، چوک اعظم میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں صحرائی مناظر، خشکی، غربت اور قحط سالیوں کے علاوہ زندگی کا کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ناصر ملک یہیں پیدا ہوئے، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر اَدبی سفر کا آغاز کیا۔ تصویر کشی اور سنگ تراشی کی طرف اولیں دور میں طبیعت مائل رہی۔ اِس دوران انہوں نے بچوں کیلیے بھی کچھ لکھا اور بعد میں لاہور کے ماہناموں میں افسانے بھیجنا شروع کر دیے۔ شائع بھی ہوتے رہے، حوصلہ افزائی ہوتی رہی اور ان کا شوق بڑھتا رہا۔ بعد میں تحقیق کے میدان میں بھی قدم رکھا۔

ناصر ملک نے کبھی بھی شعر اور تاریخ کو کہانی پر ترجیح نہیں دی بلکہ ہر تحریر کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ شاعر پہلے تھے، افسانہ نگار اور تحقیق نگار بعد میں۔ وہاں چونکہ شعر و ادب کا ماحول نہیں تھا اور اِس ہنر میں کمال کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا

،ان دِنوں یہاں کے اَدبی حلقوں تحقیق وفلسفہ میں ڈاکٹر خیال امروہوی کا نام گونجتا تھا۔ وہ ان مقتدر ہستیوں سے اَدبی استفادہ حاصل نہیں کر پائے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر خیال امروہوی اور ظفر اقبال ظفر جیسے معتبر اور معروف شاعروں کی صحبت اور رہ نمائی حاصل ہوئی تو ان کے ہنر میں پختگی آ گئی۔

ناصر ملک نے شعروادب کے ذریعہ ہی اردو کی خدمت نہیں کی بلکہ اردو زبان کے تحفظ وبقا کے لیے بھی سرگرداں رہے۔ اردو کے سلسلے میں ان کے افکار ونظریات بہت واضح ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اردو ادب کے بارے میں لوگ بے طرح مایوسی کا شکار ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دَم توڑ رہا ہے مگر انہیں ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی۔ اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں ہے لیکن اردو اکادمیوں اور اداروں کی سرگرمیوں اور ان کے فلاح وبقا پر خرچ کیے جانے والے کثیر رقم سے مثبت نتائج برآمد ہونے کی امید کرتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ وہ پاکستان میں فعال ادیبوں کی عدم سرکاری توجہ کے باوجود کی جانے والی کوششوں سے مطمئن ہوں اور ان کو یقین ہے کہ آنے والا کوئی قریبی عہد اردو زبان اور اردو اَدب کا ہوگا۔ پوری دنیا میں اردو کی صورت حال پر نظر رکھتے ہوئے بطور خاص پاکسانی ادب سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اِس وقت ملک کے اندر لسانیت، صوبائیت اور فرقہ واریت کی آگ کا جلاؤ بھڑک رہا ہے۔ وطنِ عزیز اور ہماری قوم ایسی ریشہ دوانیوں اور بدعنوانیوں کی متحمل نہیں ہے۔ دُشمن کی چالاکیاں، سازشیں اور خطرناک چالیں ہماری معاشرتی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ اس سنگین صورتِ حال کا مقابلہ صرف ادیب ہی کرسکتا ہے کیونکہ ملک کا ہر باشندہ اَدیب پر اعتماد کرتا ہے۔ اس کے لکھے ہوئے کو معتبر خیال کرتے ہوئے راہنمائی طلب کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر وادیب اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرے کو ایک مثبت سمت کی طرف لے جاسکتا ہے۔ اخوت ومحبت بھی ادیب ہی پیدا کرسکتا ہے ویسے بھی ہر ایسے دور میں پاکستانی ادیبوں نے جاندار نہ کردار ادا کیا ہے خواہ انہیں کتنی بڑی قیمت ہی ادا کیوں نہ کرنا پڑی ہو۔ وہ ادب کے ذریعہ حکومتی سطح پر پھیلی بے ضابطگیوں کو اجاگر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ 1947ء سے شروع ہونے والا سفر ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ حکومتی کارندوں کی بے ضابطگیوں کی طرف انگلی اٹھانے کے ساتھ انسانیت کے اخلاقی زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں تہذیبی زوال کی پریشانیاں بھی ہیں اور ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل کی آرزو بھی۔ بحیثیت ایک حساس شاعر کے

انہوں نے زندگی اور اس کی محرومیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔حکمراں طبقہ سے مصالحت یا سستی شہرت یا مقبولیت کو اخلاقی قدروں کے خلاف تصور کرتے ہیں۔

مصلحت جھکا دیا اس کو
ٹوٹ جاتا تو آج اس کا تھا

☆

تجھ کو تو بازوؤں پہ بہت ناز تھا مگر
دستار گر پڑی ہے تری خودکشی کے بعد
دھبے ردائے پاک پہ اتنے لگے کہ آج
دھرتی لرز اٹھی تری بخیہ گری کے بعد
غربت گھروں کے چولھے چراغوں کو کھا گئی
ہر آنکھ بجھ گئی ہے تری روشنی کے بعد
رہبر! زمانِ غار، یہ روشن خیالیاں
یہ قوم مر گئی ہے تری بُزدلی کے بعد

ہم ہر آنے والی حکومت پر انگشت اٹھاتے ہیں اور اسے اپنے لیے خدائی عذاب قرار دیتے ہیں مگر کبھی بھی ہم نے یہ سوچنے کی ہمت نہیں کی کہ ہم کونسی فصل بیج رہے ہیں۔جو شخص جتنے وسائل رکھتا ہے اتنی ہی بے ایمانی کرنے کا سوچتا رہتا ہے۔کوئی بھی شخص تعمیر کا جذبہ نہیں رکھتا بلکہ ہر کوئی اینٹ اکھاڑنے کے چکر میں ہے۔ایسے میں کوئی بھی حکومت کیا کر سکتی ہے۔حکومت عوام کے منتخب کردہ لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی حکومت ان کے گلے پڑے گی۔معاشرے میں ہر سطح پر بے ضابطگیاں، بے ایمانیاں اور بے قاعدگیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔قانون اور آئین تک محفوظ نہیں۔ آخری طبقے کا فرد بھی قانون توڑنے اور بائی پاس کرنے کے خیالات رکھتا ہے تو ایسے میں کسی بھی حکومت سے ہم یہ توقع کس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ اللہ دین کا چراغ رگڑ کر ملکی حالات سنوار دے گی۔

ناصر ملک نے اردو کے علاوہ دوسری زبانوں مثلاً میں بھی انگریزی، اردو اور پنجابی زبانوں میں بھی لکھا لیکن ان کا کثیر اور اہم سرمایہ اردو میں ہی ہے۔وہ زندگی کے حقیقتوں اور

مصائب زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔وہ اپنے اشعار کے ذریعہ ایک پر امید فضا پیدا کرنے چاہتے ہیں جس میں انسان اور انسانیت کا احترام ہو۔

ناصر ملک کی نمایاں کی خصوصیت ان کے موضوعات ہیں وہ عشق و پیان کی زبان میں دل کے لطیف جذبات کی عکاسی کرتے ہیں ۔ان کو سماج کے اس طبقہ کے ہمدردی ہے ۔جو سامراجیت کے شکار ہیں۔جن کے ہاتھ میں سخت مشقت کی وجہ سے چھالے پڑ گئے ہیں لیکن آج بھی ان کی محنت کی عوض مناسب مزدوری نہیں ملتی۔مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پھر مفلسوں نے رکھ دیے ان کے سروں پہ تاج
جن رہبروں کا ان سے کوئی واسطہ نہیں

اے زمیں! دوزخ کدہ ہے تُو غریبوں کیلیے
خون سے تُو رہبروں کو پالتی ہے کس لیے

لہو کی روشنائی سے مرے قاتل نے لکھا تھا
رہِ مقتل سجا دو، اِک مسیحا ڈھونڈ لایا ہوں

☆

مفلس ہیں، فاقہ کش جو یہاں بدنصیب لوگ
لائیں گے انقلاب وہی عن قریب لوگ
ملت کا خون چوسنے والے امیر تھے
کوٹھی لگے ہیں آج مگر ہم غریب لوگ

☆

مفلس زادوں کو لقمے بھی خون کے بدلے ملتے ہیں
ایسا حاکم کیوں دھرتی نے اپنے رَب سے مانگا تھا
بانجھ کتابوں کی قبریں تو شہر میں ہر سُو پھیلی تھیں
لیکن حرف کو ہم نے گونگے کھیت میں اگتے دیکھا تھا
کاغذ چننے والے ننھے ہاتھ میں چھالا دیکھا تو

میرے پہلو میں دل ناصر کتنی زور سے دھڑکا تھا

☆

مرے نصیب پہ روتا ہے آج کیوں منصف
مجاز تھا کہ وہ مجھ کو معاف کر دیتا
اَنا جواز کو کیسے قبول کر لیتی
مجھے شعور ہی اس کے خلاف کر دیتا

☆

لوگ قیدی ہو گئے ہیں گھر بنا کے شوق میں
بے گھروں کے سامنے دُنیا پڑی ہے آج بھی
پھر سراجِ عہد و پیماں نے جلائے ہیں نقوش
تالیوں کے شور میں وہ رو پڑی ہے آج بھی

☆

رہ گئیں محنت کشوں کے ہاتھ میں کچھ ٹہنیاں
جیت تاجر کی ہوئی، سارا ثمر اس کا ہوا
ایک نقطے میں سمٹ کے رہ گئی ہے زندگی
ایک پل میں طے جوانی کا سفر اس کا ہوا

☆

بخت بے احتیاج اس کا تھا
کھیت میرا، اَناج اس کا تھا
وقت نے کی عجب مسیحائی
درد میرا، علاج اس کا تھا

ناصر ملک کی زندگی کی سچائیوں، نشیب و فراز، آرزوؤں اور زندگی کی تمام حقیقتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً

وہ گلی میں رُک گیا تھا آج میرے روبہ رُو
اس کی باتوں میں گھلی تھی اس کے لہجے کی تھکن
ہو گیا تھا رقصِ تشنہ کام سے وہ مضمحل
چشم تر میں بھیگتی تھی ہر ستارے کی تھکن
صعوبتوں کا جہاں ہے جہانِ حرف وادب
رہینِ شوق ذرا تیز گام کر لینا

☆

میرا آغاز میری موت کے ڈر پر رکھا
گویا آلام کا سایہ میرے گھر پر رکھا
تندحَر بوں کے بپھرنے کی خبر آئی ہے
تاج قدرت نے اَنا کا میرے سر پر رکھا
عہد کے آغاز میں بہتار ہا آدم کا لہُو
دہر کے انجام کو بھی خوف وخطر پر رکھا
تُو نے اپنایا نہیں مجھ کو وگرنہ میں نے
اپنا ہر سجدہ ہمیشہ تیرے دَر پر رکھا
تقسیم کسی اور کے ہاتھوں سے ہوئی، پھر بھی
الزام میرے شہر کے لوگوں نے شجر پر رکھا
منزل کا تعین بھی بڑی بات ہے ناصر
فیصلہ قدرت نے مگر زادِ سفر پر رکھا

ناصر کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نیچر کے الفاظ کے ذریعہ اپنی شاعری کی تعمیر کرتے ہیں۔ مثلاً ان الفاظ کے ذریعہ نخل، دار، سفر، مقتل، ملک، زمین، اس طرح کے الفاظ کے ذریعہ اپنے خیالات کو شعری پیکر میں ڈالتے ہیں۔

وہ مے خانہ نہیں دشتِ جنوں کا اِک سمندر تھا

جہاں سے جگنوؤں کا میں جزیرا ڈھونڈ لایا ہوں
محبت سے کبھی اس نے مری جانب نہیں دیکھا
کہ اَب نخلِ فلک سے میں ستارا ڈھونڈ لایا ہوں

ان کی نظموں کے عناوین بھی منفرد ہیں مثلاً ''بہار، بادل، بجلی''، ''بت، برکھا اور بے ثمر'' وغیرہ ہیں۔ وہ اسی دنیا کی اشیا سے اپنی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں اور ماورائی دنیا سے الگ نئے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہجرت ایک ایسا المیہ رہا ہے جس نے انسانیت کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ناصر ملک کی اس مسئلے کو پیش کرتے ہیں۔ آج زمانہ میں کتنی بھی ترقی کیوں نہ کر لی ہو آمد و رفت کتنا ہی آسان سے آسان تر کیوں نہ ہو گیا ہے برقی ذرائع سے دوریاں کیوں نہ مٹا دی گئی ہو لیکن آج بھی روٹی کپڑا اور مکان اس تعلیم بھی شامل کر لینا چاہئے کے مسائل جوں کہ توں ہیں اور ایک مہاجر اس کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ناصر ملک نے انہیں کی ترجمانی کی ہے۔

ہے پڑاؤ رائیگاں ناصر تمہارا شہر میں
ہجرتوں کے دور میں یہ بھی نگر اس کا ہوا
مجھ کو میرے شہر میں بدنام کرنے کے لیے
آ گیا ہے میرا گھر نیلام کرنے کے لیے
اَب ضروری ہو گیا ہے میرا تجھ کو چھوڑنا
زندگی میں اور بھی ہیں کام کرنے کے لیے

☆

ہجرت میں ریاضت کی تھکن میرے لیے تھی
ریت میری تھی مگر رنگِ صدف اس کے لیے تھا
اسے ہجرت کا شوق کتنا تھا
اپنا گھر تک جلا دیا اس نے

ناصر ملک کی شاعری میں تغزل کا خوبصورت انداز ملتا ہے۔

ایک سورج آ گیا تھا آئینے کے روبرو

زلف کو کھلنا پڑا تھا کام کرنے کے لیے

☆

آج، اِسی لمحے، اِسی وقت، یہیں سے ہو
عشق آغاز تو ہو، چاہے نہیں سے ہو
برسوں اِس آس پہ جاگیں میری پُرنم آنکھیں
سامنا وَید کا مجھ خاک نشیں سے ہو
کوئی روزہ نہ دُعائیں نہ عبادت درکار
عشق کافی ہے مگر پختہ یقیں سے ہو
منصف لیے پھرتے ہیں تماشائی آنکھیں
ظلم پھر کیسے عیاں اس کی جبیں سے ہو
یوں تو ظلمت کے ستاروں سے کئی اترے ہیں
کسی راہ بَر کا تعلق تو زمیں سے ہو
آؤ اِس ریت پہ ہم خیمے لگائیں ناصر
چشمِ جاناں بَر ملا یہ کہہ گئی ہے دوستو!
پیار کی دولت نہیں ہے عام کرنے کے لیے
حیرت سے دیکھتا ہے پلٹ کر مرا جنوں
یہ کس نے اس کو چوم لیا اور مر گیا
وہ شخص باخبر تو ہے میرے ملال سے
آنے کا اس کے پاس مگر راستہ نہیں
اس کو جانے کی جلدی تھی ورنہ میں بھی
آخر اِک دن اس کے دل کو بھا سکتا تھا
میرا فن بھی ایک جدائی مانگ رہا تھا
ورنہ جانے والا واپس آ سکتا تھا

میں ہنر میں طاق تھا یا اس کا پیکر موم تھا
میرے ہاتھوں میں کھلا تو میرے جیسا ہو گیا

☆

کیا خبر تھی اِس طرح رستہ جُدا ہو جائے گا
وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے خفا ہو جائے گا
دھڑکنوں سے آج کیسی پھوٹتی ہے یہ صدا
دل بڑا ویران ہے، کیا حادثہ ہو جائے گا

☆

رہین بخیہ گر تو ہے مگر ملحوظ خاطر ہو
مِری دستار کو تم نے کبھی ململ نہیں کہنا
محبت اضطرابِ زندگی کے ساتھ پلتی ہے
سکونِ دل کو ناصرؔ مسئلے کا حل نہیں کہنا

ناصر ملک کی شاعری میں تاریخ اسلامی سے خوبصورت تر اور معنی خیز تلمیحات ہی بھی ملتی ہیں۔

لہو نے روک رکھی ہیں یزیدِ وقت کی راہیں
زمانہ کس طرح رو کے مجھے خیمے لگانے سے
کھٹکتا ہوں میں فرعونِ جہاں کی سرخ آنکھوں میں
مگر ٹلتا نہیں پھر بھی غریبوں کو جگانے سے

ناصر ملک کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری زندگی کے ہمہ جہت مسائل آرزوؤں، امنگیں اور احساس وجذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔موجودہ دور میں وہ ایک عظیم شاعر وفنکار کی حیثیت سے ہماری اردو کی میراث کا حصہ ہے اور مسلسل اردو شعر وادب کی خدمت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔عالمی ادب کے اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے پر ان کی شاعری کو پرکھیں تو وہ اس میں کھڑی اتریں گی۔وہ دن دور نہیں جب گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے نصاب میں ان کی شاعری مطالعہ میں رکھی جائے گی۔

سائنسی فکشن مائکرو فکشن کے خصوصی حوالے سے

غلام مصطفیٰ
ریسرچ اسکالر جے این یو، نئی دہلی

انسان کرہِ ارضی پر اپنی ارتقائی کوششوں کے ہمراہ دیگر ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتے ہوئے زمانے کی چالبازی سمجھتا اور سمجھاتا آج اکیسویں صدی کے ایسے مشکل ترین حالات میں کھڑا ہے جہاں اس کے ذریعے اٹھایا جانے والا کوئی ایک غلط قدم بھی کل جاندار زندگیوں کے نیست و نابود ہوجانے کا سبب ہوسکتا ہے۔ترقی انسان کا وطیرہ ہے بلکہ اس مخلوق کی سرشت میں شامل ایک فطری عمل ہے۔لیکن ترقی جب دوڑ بن جائے اور ہار جیت کی بولیاں لگ جائیں تب اسی ترقی کے دامن میں چھپا ہوا وحشت ناک اور تباہ کن نتیجہ موجود رہوتا ہے۔

یہ عام سا جملہ تو شائد ہم سبھی نے سن رکھا ہوگا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ہمارے عہد کی بے شمار مصروفیات ہم سے مختصر سے مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ کام انجام دے لینے کا تقاضہ کرتی ہیں۔لہذا اس ضرورت کے تحت دنیا کی تمام تر ایجادات مائکرو ہوتی جارہی ہیں۔ایک یو۔ایس۔بی میں لاکھوں الفاظ محفوظ کیے جاسکتے ہیں۔آج کے عہد میں ایک ای بک کتابوں کا پورا شیلف سمیٹ لیتی ہے۔ایک چپ میں فون کے سینکڑوں نمبرات محفوظ ہوجاتے ہیں۔لہذا کہانیوں کا بھی وقت کے تقاضے کی سبب مائکرو ہونا فطری ہے۔اب افسانے سے مختصر افسانہ اور پھر مختصر ترین افسانہ لوگوں کو متوجہ کررہا ہے۔سوال یہ ہے کہ اس کا نام اردو میں لکھا جائے تو مختصر ترین میں کوئی مضائقہ نہیں۔لیکن مائکرو فکشن کو آخر ترجمہ ہی کیوں کیا جائے؟۔مائکرو کو اگر مختصر ترین کہیں گے تو یہ پانچ کے بجائے مختصر ترین کے نو حروف اس صنف کے نام ہی کو اتنا طویل کردیں گے کہ ہماری ادب میں طویل ترین اصناف کا ناموں سے اس کا سٹرکچر بڑا دکھائی دے گا اور پھر یہاں

تو بے شمار انگریزی الفاظ و اصطلاحات اردو میں شامل ہو کر اس خاندان کا حصہ بن چکی ہیں۔

مائکرو فکشن لکھنے کے شرائط سخت ہیں۔ مثلاً اس سے اس طرح سمجھا جائے تو بہتر ہوگا کہ تین سو الفاظ کے افسانے میں گنے چنے اور منتخب الفاظ ہوں جو معنی کی تمام تر تہہ داری کو سمیٹ لیں اور ان میں ایک مکمل افسانوی پن اپنے تمام تر محاسن کے ساتھ موجود ہو۔ بلکہ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ مختصر ترین افسانہ یا مائکرو فکشن اپنی بُنت میں افسانے سے زیادہ مشکل ہے۔ اب ایک پریشانی یہ بھی ہے کہ افسانے کی دنیا کو اگر پوری طرح سمجھا نہ گیا اور لکھنے والوں کی تعداد محض ایک لاشعوری کاوش کے تحت بڑھتی گئی تو عین ممکن ہے کہ مائکرو فکشن کا زوال بھی نثری نظم کی طرح ہی ہو جائے۔ Antony Nelson ایک معروف مائکرو فکشن رائٹر ہیں۔ انہوں نے ایک ورکشاپ کے دوران اپنے پہلے ڈرافٹ میں غیر ضروری الفاظ کو خارج کر کے سمجھایا تھا کہ مائکرو فکشن میں الفاظ کا استعمال کس قدر محتاط صورتوں میں ہونا چاہیے۔ مائکرو فکشن پر کام کرنے والے، اس میدان میں طبع آزما ہونے والے کہانی کاروں کو چند اہم مصنفین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جن میں سے چند مشہور نام یہ ہیں۔ Adgar Allen Poe, Antonya Nelson, Anna D Smith,Dawn,Mark leyner. وغیرہ وغیرہ۔

مائیکرو فکشن کئی موضوعات کے تحت لکھا جا سکتا ہے، اس میں فلیش مائکرو فکشن، سسپنس اسٹوریز، سائنسی مائکروف، تھرلرز، علامتی مائیکروف وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں سے سائنسی مائکروف اور فلیش فکشن کے ساتھ ساتھ مختصر ترین علامتی کہانیاں بھی انہماک انٹرنیشنل فورم پر پیش کی جا چکی ہیں۔ مائکرو فکشن، لب گو افسانہ، سمارٹ اسٹوری، منی اسٹوری، افسانچہ یا مختصر ترین کہانیوں میں سے ایک اہم نام ہے جس سے ہم زیادہ موزوں سمجھتے ہیں وہ مائکرو فکشن ہی ہے، کیونکہ افسانچہ اور دوسرے سبھی ناموں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مختصر ترین کہانی یا مائکرو فکشن افسانچے سے مختلف ہے، کیونکہ افسانچے کا خمیر افسانے کے بطن سے تیار ہوا ہے اور افسانے کی واحد بڑی ضرورت کہانی پن افسانچے کی بھی ضرورت ہے ورنہ یہ صنف اپنی روایتوں سے کٹ کر کوئی دوسرا سٹرکچر پیش کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن مائکرو فکشن لفظوں کے انتخاب میں بھی سختی کا قائل ہے اور موضوع کی باریکیوں سے بحث کرتا ہے یہاں کسی واقع یا افسانے سے زیادہ موضوع اور اس کے متعلقات سے

سروکار رہتا ہے۔ پھر بھی تا حال اس صنف پر اہل فکر ونظر کی محنت درکار ہے۔اس سے ابھی تعریف ہونا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں کہ یہ اپنے آپ میں وجود اور تعریف سے عاری ہوتے ہوئے بھی وقت کی ضرورت بن چکا ہے۔کسی بھی قصہ گوئی میں قصے کو کتنے الفاظ میں بیان کرنا ہے یہ تو اس کہانی کے عناصر پر منحصر ہوتا ہے،اور پھر مائکرو فکشن تو چونکہ نام سے ہی ظاہر ہے کہانی کی مختصر ترین شکل ہے اس لیے یہاں الفاظ کا انتخاب اور زبان پر دسترس اس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔

سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سائنسی فکشن آخر ہے کیا؟۔تو پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا سائنسی فکشن میں سارے سائنسی لوزمات ہونے ضروری ہیں۔میرے خیال میں تو اگر کسی ممکنہ ایجاد کو اس کے طریقۂ کار سمجھاتے ہوئے فکشن میں ممکن کر دیا جائے اور پھر کسی معاشرے پر اس کے اثرات بھی بتائے جائیں تو یہ ایک مکمل سائنسی فکشن ہوسکتا ہے۔اس ضمن میں خود سائنس کا مطالعہ ضروری ہے لیکن سائنس کے مطالعہ فرمانے والے اہلِ دانش سمجھتے ہیں بلکہ خوب جانتے ہیں کہ خود سائنس بسا اوقات صرف لفظوں کے سہارے اپنے معنی ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔نیٹون کا تیسرا لا "Every action there is an equal and opposite reaction " کیا اپنے متن کے ہر لفظ پر کھرا اترتا ہے؟۔سائنس کا کوئی معمولی جانکار بھی جب اس جملے کو رٹا رٹایا پیش کرتا ہے اور سامنے والا اس سے اگر یہ سوال پیش کرے کہ جس گیند کو دیوار پر پھینکے جانے پر پھینکی گئی رفتار کے برابر واپس آتا دیکھا گیا تھا کیا اسی رفتار سے وہ ریت کیچڑ یا پانی میں پھینکی جائے تو برابر رسپانس مل پائے گا؟ اور نہیں جو کہ ظاہر ہیکہ نہیں ہوتا تو کیوں نہیں ہو پاتا۔لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ فزکس کا طالبِ علم نیوٹن کے اس لا کی سچائی پیش نہیں کر سکتا۔سائنس کا مطالعہ بھی صرف متن کی ظاہری صورت میں نہیں کیا جا سکتا ورنہ نیوٹن جیسا سائنسدان بھی اپنے متن کے ان الفاظ میں اس لا کی باقی تمام سائنسی جانکاری سے نابلد آدمی کے لیے اپنی اصل میں جاہل ثابت ہوسکتا ہے۔کیونکہ ایک عام قاری تو اس کے اس متن میں Every action پر ہی بات کرے گا۔انگریزی فکشن کے ذخیرے میں سائنسی فکشن بہت پہلے سے موجود ہے۔ہمارے اردو ادب میں بھی سائنسی اصطلاحات موجود ہیں۔لیکن سائنس فکشن کی طرف ہماری شعوری کاوشیں بہت کم رہی ہیں،سوائے چند گنے چنے ناول نگاروں کے ہم نے اپنے اردو ادب میں کوئی بڑا ذخیرہ نہیں رکھا

ہے۔لیکن میرا یہ بھی ماننا ہے کہ زبان بذاتِ خود ایک سائنسی عمل ہے،لسانیاتی علوم سے واقفیت رکھنے والے ہر اہلِ زبان کو یہ معلوم ہے کہ کسی بھی لفظ میں موجود جہاں ایک سماجی استعارہ ہے وہیں اس لفظ کی بناوٹ اور اسی کے پسِ پردہ ایک سائنٹفک سوچ اور بحث موجود ہے۔مثلاً راجہ گدھ کے قاری نے شائد غور نا کیا ہو کہ راجہ اور گدھ کا آپسی تعلق کیا ہے۔کیا گدھ بطور ایک جاندار سائنسی علوم سے دور کوئی مافوق الفطری شے ہے؟ جیسے گدھ ایک سائنٹفک سٹڈی رکھتا ہے اس کی الگ ایک پہچان ہے اس بات سے کبھی بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گدھ کو سائنس اس کے اوصافِ کل کے ساتھ جانتی ہے۔اس کی عادتیں خصلتیں پہچانتی ہے لیکن مذکورہ ناول میں راجہ گدھ کی قرأت کے دوران اس لفظ کا استعمال کسی بھی قاری کو کوئی سائنٹفک نظر کیوں مہیا نہیں کرتا اور نا ہی ہم میں سے کوئی ان خوبیوں خامیوں پر کبھی بحث کرتا ہے، یونہی منٹو کا افسانہ ٹوپہ ٹیک سنگھ، حالانکہ اپنے نام میں افسانوی کردار ہے لیکن کردار کی ذہنی حالت و کیفیت سائنٹفک معلومات فراہم کرتی ہے۔سائنس اب تک اپنے بڑے اور اہم موضوعات میں کائنات کے علوم اور سیاروں کی کھوج کے ساتھ ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کے ہمراہ ادویات وضروریاتِ زندگی اور انسانی نفسیات اور امراض کی تشخیص میں منہمک ہے۔ہمارا ادب ان موضوعات کو فکشن کے ذریعے پیش کرتا چلا آرہا ہے بلکہ اردو ناولوں اور افسانوں میں اگر لفظوں کی سانس اور ان سانسوں میں موجود تحقیقی سائنس کا عمل بغور دیکھا جائے تو بجا طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ سائنس یہاں جس رفتار سے لیبارٹریز میں برتی جارہی ہے اور جہاں تک ہم نے دنیا کو سائنسی معلومات عطا کی ہیں ظاہر سی بات ہے ادب بھی اسی رفتار سے اس موضوع کو پیش کرتا چلا آرہا ہے۔رہی بات عالمی برادری میں سائنسی معلومات و مشاہدات کی تو محض اردو ادب ہی اس کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔یہاں کسی دوسری زبان کا ادب بھی اس موضوع میں وکلان ہے بالکل معذور ہے۔ہمارے اردو تخلیق کار عام طور پر تین طرح کے ہی ہیں ایک وہ جنہیں شہرت کی ہوس ہے دوسرے جنہیں یہ زبان علمی اظہار کا وسیلہ معلوم ہوتی ہے اور تیسرے کسمپرسی کا شکار لاچار و بیکار ہر جگہ سے ٹھکرائے ہوئے، بلکہ یہاں موجود کسی طبقے کا نام رہ گیا ہے تو وہ اپنے طور پر تعین کر سکتے ہیں۔لیکن یہ دوسرا طبقہ اس سائنسی میدان کی طرف قدم بڑھا سکتا تھا بحر حال مصیبت یہ ہے کہ اس طبقے کی نظریں بھی نسبتاً علمِ فلسفہ پر زیادہ رہیں ہیں اور مشاہداتی

علوم یا تو اس طبقے کی سمجھ سے وراء رہے یا پھر شعوری طور پر رنگین نثر کے عادی سائنسی علوم میں کھری اور سیدھی زبان قبول نہیں کرنا چاہتے۔ خیر ہماری بحث ان عوامل پر نہیں ہے جو اردو ادب میں سائنسی علوم کے بچھڑنے کی بِنا ہیں۔ بلکہ اردو ادب میں سائنسی فکشن کے مستقبل کو مائکرو فکشن کی نظر سے دیکھنے پر ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ رابرٹ بریفلٹ کے مطابق ''سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے اور مشاہدے کے نئے اسلوب ہیں جن سے لوگ بے خبر ہیں''۔

سائنسی علوم میں کوئی ایک مفروضہ قائم کر لیا جاتا ہے اور پھر اسی ہائپوتھیسس کو سچ ثابت کرنے کے لیے یا اس کی جانچ تجربات در تجربات Experiment کے لیے منظّم راستہ تلاش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک نظریہ یعنی Theory کے ذریعے Pridiction کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر یہ پیشن گوئی منفی نتائج کی صورت میں سامنے آئے تو صداقت کی مشکوک ہونے کی صورت میں جبکہ پیشن گوئی منفی نتائج کی حالت میں سامنے آئے تو یہی پیشن گوئی Law یعنی قانون کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

سائنس کا بنیادی مقصد کائنات کو طبعیات کی روشنی میں دیکھنا اور طبعی و معاشرتی سائنسوں کے باہم اشتراک سے انسانی مسائل، ان کا حل اور زندگی میں در آنے والے واقعات و حالات کا سائنسی طرزِ فکر کی روشنی میں درست انداز لگانا ہوتا ہے۔ اسی طرح کائنات اور فکر کی تسخیر کا نام ادب ہے گویا ادب فکری جمود کو موضوعاتی صورت میں پھیلا کر ایک ایسے منظّم طریقے سے پیش کرتا ہے جس کے وسیلے سے انسانی ذہن علم و ادراک کی وسعتوں کو کسی ایک دائرے تک محدود نہیں کر پاتا۔ بلکہ یہ پوری کائنات کو موضوع بنا کر مرکزی نقطۂ فکر کے شعوری حوالوں کو پیش کرتا ہے۔ ادب کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے لکھا ہے کہ ''ادب کو تخلیق کا ماحصل مان کر اتنا تو بحر حال ماننا پڑے گا کہ ادب اپنی کلیت و ماہیت میں علم و فکر یا فلسفہ و منطق کا اسیر و خلیف نہیں بلکہ ایک حد تک ان کا نقیض و حریف ہے۔ علم کی صورت یہ ہے کہ وہ فرد کے ذاتی میلانات و جذبات کو مس کرتے ہوئے گذرے تو نا معتبر ٹھہرے گا، اس لیے محض علم کی بنیاد پر ادب کے بارے میں کوئی حکم لگانا نا مناسب نہ ہوگا''۔ اب اگر یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ ادب تاریخی شعور اور سائنسی طرزِ فکر کے دباؤ سے آزاد ہو کر تخلیقی عمل کو بیان کرنے کا نام ہے۔

ادبی نظریات عام طور پر تین ہوسکتے ہیں ۔رومانی،علمی ،اورفکری۔یہ تینوں نظریات بیک وقت یکجا ہوکر کسی بھی ادیب کے لیے فکری راہوں کا تعین کرتے ہیں۔اسی طرح ادب تمثال کی دنیا سے اپنا خمیر تیار کرتا ہے لیکن ایسا تو ہرگز نہیں ہے کہ خیالات وتصورات اتنے جامد پن کا شکار ہوں کہ شعور کی دنیا میں یکا یک وارد ہوجائیں اور اپنا عکس چھوڑ کر پھر کہیں لاشعور میں گم ہوجائیں۔ بلکہ یہ خیالات وتصورات تو حالات وواقعات کا ایسا سنگم ہوتے ہیں جو خیالات کو خارج سے منطبق کرتے ہوئے ذہنی وفکری تمثال اور امیجری کے ساتھ مربوط کرنے کا پورا عمل انجام دیتے ہیں۔ اب سائنس کے اس حصے کا مطالعہ کیا جائے جہاں سائنس اپنے ضابطۂ عقائد میں اشیاء کے عدم کی صورت میں ہائپوتھیسس کے ذریعے عالمِ تصورات کے بطن سے ایک نئے عقیدے،صورت، وجود یا نئی کھوج کو مشاہدے کی شکل میں ڈھالتی ہے۔وہاں یعنی اس ہائپوتھیسس کی بنیادوں میں شامل ایک تمثال یا امیج جو ظاہر ہے کہ تصوراتی ہے کو فکشن میں شامل کرنے کی ضرورت ہے اور یہاں تک پہنچنے کے لیے کسی فکشن نگار بالخصوص مائکروف رائٹر یا سائنسی مائکروفکشن نگار کو لفظوں کے انتخاب، موضوع میں سائنسی تصور اور اس تصور سے پیدا ہونے والی مشاہداتی فکر کے لیے جس محنت ولگن کی ضرورت ہے ہمارے یہاں اردو مصنفین اس دنیا میں پہنچنا تو کجا اس کا علم بھی نہیں رکھتے ہیں۔ ایسے حالات میں انہاک انٹرنیشل فورم نے ایک ایونٹ ضرور پیش کیا تھا لیکن وہاں بھی سائنسی مائکروفکشن کے بجائے فکشن تھرلرز یا فکشن سسپنس زیادہ نظر آئے۔اردو علامتیں اور ہمارا لسانیاتی ڈھانچہ اتنا مفلوک الحال نہیں ہے کہ یہاں سائنسی فکشن پیش نا کیا جاسکے۔ہمیں ضرور اس میدان میں شعوری کوشش کرنی چاہیے۔

بالکل آخیر میں ایک بات صاف کرتے ہوئے اس موضوع کو یہیں سمیٹنا مناسب سمجھوں کہ میں نے اس مقالے میں مائکروفکشن کو ہی سائنسی فکشن کے لیے کوئی منتخب کیا تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بھی مضمون کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ وقت وحالات کے عین موافق ہو،قاری پر بوجھل نہ ہو اور کسی بڑے موضوع کو نامکمل پیش کرنے سے بہتر ہے کہ کسی ایک چھوٹے حصے کو سرمایہ بنایا جائے۔ ہم اگر اردو ادب کو ایجادات کی دنیا سے مانوس کرنا چاہتے ہیں اور مشاہدات کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو بڑی بڑی مشینیں تیار کرنے کے نامعلوم دنیا کے غیر تعبیر شدہ آسمانی خواب دیکھنے کے بجائے مشینوں

میں استعمال ہونے والے معمولی پرزوں پر غور خوض کر کے زمین کی حقیقت سے جڑنا ہوگا۔اور ان معمولی پرزوں کو جو ایک ادبی صنف آسانی سے آج کی قاری کی مصروفیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش کر سکتی ہے میرے خیال میں سائنسی مائکرو فکشن سے بہتر کوئی دوسری صنف سخن نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆

جنوبی کشمیر میں ایک سنجیدہ شاعر: شوریدہ کاشمیری

ڈاکٹر نصیر احمد ڈار
منیوار، اننت ناگ، کشمیر

جنوبی کشمیر میں اردو زبان و شاعری بحوالہ صنف غزل کے خدوخال سنوارنے اور سلسلے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے والوں میں شوریدہ کشمیری کا مقام منفرد اور یکتا ہے۔ وہ سخن وروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتے تھے جو بیسویں صدی کے آخری نصب میں جنوبی کشمیر میں ادبی منظر نامے پر چھائے رہے۔ انہوں نے غزلوں میں خوب طبع ازمائی کی اور کامیاب تجربے کیے۔ ان کے غزلوں کا ایک رنگ طرز و مزاح کا ہے اور یہ مانا جاتا ہے کہ اگر وہ اس جانب سنجیدگی سے توجہ کرتے تو آج انکا شمار جنوبی کشمیر کے علاوہ ریاست جموں و کشمیر، حتی کہ برصغیر کے قابل ذکر طنز نگاروں میں ہوتا۔

جنوبی کشمیر میں شوریدہ کاشمیری اپنے عہد کے سماجی مسائل تنہائی، بے چارگی، ناکامی، شکستہ خوردگی، ناامیدی، زندگی کی تلخیاں اور بے بسی وغیرہ کو بھی موضوع بنایا ہے مگر فن پر مضبوط گرفت ہونے کی وجہ سے وہ ترسیل کی ناکامی سے بچ گئی ہیں۔ ان کے کلام میں بڑی تہہ داری پائی جاتی ہے۔ جہاں انکا لہجہ طنزیہ ہو گیا ہے وہاں تلخی بھی پیدا ہو گی ہے۔ لیکن وہ اپنے برجستہ اور بے تکلف لہجے اور گن گناہٹ سے اس تلخی کو قابل قبول بنا دیتے ہیں۔

انہوں نے ایک شاعری مجموعہ ''جذب دروں'' کے نام سے تصنیف کیا ہے جیسے کہ انہں بہت جلد جنوبی کشمیر کے ادبی حلقوں میں بلندی عطا کر دی۔ ان کے غزلوں میں کلاسیکی آب و تاب کے ساتھ ساتھ روایت کا زبردست شعور نظر آتا ہے۔ انہوں نے اردو شعر و ادب کی کلاس کیی روایات کو اپنے اندر کچھ اس طرح جذب کر لیا تھا کہ بعض اوقات ان کی غزلیں قدامت کے بوجھ

تلے دبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چند اشعار یوں ہیں۔

رہا کیا ہے میرے بغمائے دل میں
فقط ایک غم ہے جو پیہم ہے باقی
غم میں یوں دل کا داغ ہے روشن
شب کو جیسے چراغ ہے روشن [1]

شوریدہ کاشمیری کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہین جن میں انکا لہجہ عصر حاضر کے میانہ روجدید شعراء کی طرح روایت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی نیا نیا سا ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کیا جانے ہم خود بدلے ہیں یا دینا ہی بدلی ہے
جانے پہنچانے لوگوں میں بے گانے سے لگتے ہیں [2]

اس نوع کے اشعار سے انداز ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی سوچ وفکر، لہجے اور تخلیقی رویے کو ذرا سا اور فروغ دیتے تو ان کی اہمیت اور معنویت میں اوا ضافہ ہوتا۔

شوریدہ کاشمیری اپنی ایک کتاب ''خطاب خامہ'' میں خود اپنی شاعری سے مخاطب فرماتے ہیں۔ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میری شاعری جھوٹ موٹ کا رونا دھونا اور خیالی عشق بازی نہیں۔ اس میں قلبی واردات، سیاسی، اخلاقی اور دوسرے خیالات کا بھی نظم ہوتے رہتے ہیں۔''

انہیں بنیادی خیالات کو شوریدہ کاشمیری نے اپنی غزلوں میں یوں باندھا ہے۔

حسن وخوبی کی ہے شیدا شاعری — خود بخود ہوتی ہے پیدا شاعری
انفس وآفاق میں دکھلائے ہے — قدرت حق کا تماشا شاعری [1]

شوریدہ کاشمیری کو زمانہ طالب علمی سے ہی شعر گوئی سے شغف تھا۔ وہ مزاجاً لڑکپن ہی سے ہی عاشقانہ تھے۔ جیسا کہ وہ خود ہی فرماتے ہیں۔

عجیب تھا ہائے کالج کا وہ دور طالب علمی
جب آتے جاتے میں ہوتا تھا ہم پہلوئے جانانہ۔

اردو ادب کے بڑے صاحب طرز اور عہد ساز شعراء کے علاوہ بھی شوریدہ کاشمیری کی شاعری پر بالخصوص اپنی غزلوں پر اثرات کہیں کنایتا اور کہیں وضاحتاً نمایاں ہیں۔ ذیل کے چند

اشعار بطور نمونہ تحریر پیش کیا گیا ہے۔

وہ خسار دیکھے کوئی کس طرح اسے نور میں وہ چھپانے لگے

حسن درجہ شعلہ بار ہوا لاکھ پردوں سے آشکار ہوا

شوریدہ کاشمیری اخری ایام میں اننت ناگ چلے گئے وہاں انکا انتقال ہوا اور ان کی شوریدہ سری کو بھی وہاں کی بیوں اور مٹی نے ہی اسودہ کرلیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

جنوبی کشمیر میں شوریدہ کاشمیری کی کلہم شاعری کو مدِ نظر رکھ کر آخر مین ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکے یہاں موضوع کا تنوع، الفاظ کی سادگی، تمثیل، علامتی پیرایہ، حکایتی انداز، مناسب و متضاد الفاظ، رمزیہ و اشارتی طریقہ کار لہجے کا زخمی پن، حزنیہ کیفیات، ان تمام عناصر سے مرکب شوریدہ کاشمیری کی شاعری ان کے ادبی تدفین اضافے کا باعث ہے وہ مختلف زاویوں سے تفہیم و تعبیر کا تقاضہ کرتی ہے جو شعر میں بڑا انماک رکھتے۔ اردو کے کلاس کی شاعر سرمایا، فن کے اسرار و رموز، بیان اور حُسنِ بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور جنوب کے اچھے صاحبِ فکر شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کے روایت کو جنوبِ کشمیر میں نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اِس کو مستحکم بھی کرلیا گیا۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ کشمیر میں اردو از عبدالقادر سروری۔ جلد دوم، ص ۳۹۱۔۳۹۲

۲۔ شیرازہ۔ کلچرل اکیڈمی سرینگر۔ جلد ۵۲ گوشہ شوریدہ کاشمیری۔

عصر حاضر میں کشمیر میں فارسی ادب کی اہمیت

ڈاکٹر شبیر احمد وانی
شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی

ملخص

زبان کسی بھی قوم کی ترقی کا آیئنہ دار ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کی اگر کسی قوم کی تہذیب و ثقافت کو مٹانا ہو تو اس قوم کی زبان کو ختم کیا جائے۔ انگریزی حکومت نے اس پالیسی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی مقامی زبانوں کو منسوخ کر کے اپنی زبان رائج کی جس کا سب سے پہلا اور اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی عوام تہذیب وثقافت سے بیگانہ ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھی ،یہی طرز عمل کشمیر میں بھی اختیار کیا گیا اور کشمیری اور فارسی زبانوں میں جو لسانیاتی رابطہ تھا وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ اس مقالے میں کشمیر میں فارسی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے یہاں کے مختلف فارسی دستاویزات سے جدید موضوعات پر اقتباسات درج کیے ہیں تا کہ قارئین مشاہدہ کر سکیں کہ فارسی زبان کے جاننے والے نہ صرف ادب بلکہ سائنسی علوم پر بھی مکمل مہارت رکھتے تھے۔

کلیدی الفاظ: فارسی زبان، ادب، تہذیب، ثقافت، کشمیر، سائنس

☆☆☆

مقدمہ:

فارسی ان فراموش شدہ زبانوں میں ایک ایسی زبان ہے جو سلطان قطب الدین ایبک کی تخت نشینی یعنی ۶۰۰ھ/1203ء سے لیکر ۱۲۵۰ھ/1833ء تک کم سے کم ۶۳۰ سال سرکاری اور دفتری زبان رہی ہے۔ اگر چہ انگریزوں نے 1833ء میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کیا تاہم فارسی نے سات صدیوں میں جو نقوش یہاں کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی زندگی پر ثبت کیے تھے ان کو مٹانا ممکن نہیں تھا۔ ان سات صدیوں میں زندگی کے ہر پہلو

پر قلم اٹھانے کے لیے فارسی زبان کا ہی انتخاب کیا گیا۔ دور مملوکیہ کی علی بن حامد کا چچ نامہ، حسن نظامی کی تاج المآثر، منہاج سراج کی طبقات ناصری اور خلجی و تغلق دور کی ضیاالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی، امیر خسرو کی خزائن الفتوح کے علاوہ ان کی تاریخی مثنویوں کو اگر تاریخ سے محو کر دیا جاتا تو ہندوستانی مسلم حکمرانوں کا پہلا ہی باب گمنامی کے پردے میں چلا جاتا اور ہم ہندوستان کے دوسو سال کی تہذیبی، ثقافتی، سماجی، عملی، مذہبی اور معاشرت ورثے سے محروم ہو جاتے۔ اس زمانے میں فارسی میں سینکڑوں ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں لوگوں کا رہن سہن، مذہبی امور، تہوار، قدرتی حادثات، جغرافیہ، فقہ، تصوف، طب، ریاضی، ماحولیات غرض معاشرے کی زندگی کا ہر پہلو ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے۔

مغل دور کو ہندوستان میں فارسی تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے زرین دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں تاریخ اور تذکروں کے علاوہ مذہب، تصوف، لغت، سماجیات، معاشیات پر شاہکار کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں۔ تاریخ میں گلبدن بیگم کا 'ہمایوں نامہ'، ابوالفضل کا 'اکبر نامہ' اور 'آئین اکبری'، عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ'، عبدالباقی نہاوندی کی 'مآثر رحیمی'، جہانگیر کی 'تزک جہانگیری'، میر قاسم کی 'تاریخ فرشتہ'، محمد امین قزوینی اور عبدالحمید لاہوری کے 'پادشاہ نامے' اور محمد صالح کنبوہ کا 'عمل صالح' کے علاوہ تاریخ پر مبنی ایسی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن کے مطالعہ کے بغیر کوئی بھی تاریخ کا طالب علم ماضی سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتا۔ جہاں تک تذکروں کا سوال ہے تو اس دور میں فارسی زبان میں فارسی شعرا کے احوال و کوائف پر ہاتھ سے لکھے گئے بہترین نسخے تحریر ہوئے جو نہ صرف اس دور کے شعرا کے ادبی محاسن، ان کی سیاسی، سماجی اور ذاتی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ خطاطی (Calliography) کا بھی بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ مغل دور کے معروف تذکروں میں 'ہمیشہ بہار' از کشن چند اخلاص، 'شام غریبان' و 'گل رعنا' از لچھمی نارائن شفق، 'کلمات الشعراء' از محمد افضل سرخوش، 'مرآۃ الخیال' از شیر خان لودی، 'سفینہ خوشگو' از بندرابن داس خوشگو، 'مجمع النفائس' از سراج الدین علی خان آرزو، 'ریاض الاشعر' از علی قلی خان والہ داغستانی، 'مردم دیدہ' از ملا عبدالحکیم، 'تذکرہ حسینی' از میر حسین دوست، علی ابراہیم خان خلیل کے

'خلاصۃ الکلام'، 'گلزار ابراہیم' وصحف ابراہیم اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کے 'تذکرے خزانۂ عامرہ'، 'سرو آزاد' اور 'ید بیضا' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے فارسی زبان کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ ہندوستان کے اکثر علمائے عظام اور صوفیاء کرام نے فارسی زبان کو ہی اپنی تفسیروں، تحریروں اور تقریروں کا وسیلہ بنایا۔ مملوکیہ دور میں مرتب کیے گئے 'دلیل العارفین' اور 'فوائد السالکین' (خواجہ معین الدین چشتیؒ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوضات) اور خلجی و تغلق دور میں 'فوائد الفواد' اور 'افضل الفوائد' (حضرت نظام الدین کے ملفوظات) اور اسی طرح کی دوسری تصانیف طالبان کے لیے ہمیشہ سے ہدایت کا سرچشمہ رہی ہیں۔ تغلق دور میں ہمیں نہ فقط تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم اسلامیہ پر تفسیر تاتارخانی، فقہ فیروز شاہی، فتاویٰ قراخانی، فتاویٰ تاتارخانی، فتاویٰ جہانداری، صحیفہ نعت محمدیؐ، سیر الاولیاء وغیرہ جیسی تالیفات ملتی ہیں، بلکہ علم طب پر شفاء الخالی، تشریح البدن پر جزئیات وکلیات، نجوم پر دلائل فیروز شاہی اور موسیقی پر غنیۃ المینہ اور کنز التحف جیسے کارنامے بھی انجام پائے ہیں۔

مغلیہ دور میں امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے رسائل اور مکتوبات کے مجموعے علم وحکمت کے ذخائر ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی معروف تالیفات 'مدارج النبوۃ' اور 'جذب القلوب فی دیار المحبوب' اسلامی تاریخ وتمدن کا نمونہ ہے شاہ ولی اللہ دہلوی نے کلام پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا اور مؤطا امام مالک کی 'المصفّیٰ' کے نام سے شرح بھی لکھی۔ اس عہد کا ایک کارنامہ 'فتاویٰ عالمگیری' ہے جو برصغیر میں فقہ کی ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے۔

اصل موضوع:

کشمیر کو فارسی زبان سے گہری وابستگی رہی ہے اگر چہ کشمیر اور ایران کے مابین اشاعت اسلام سے قبل بھی روابط رہے ہیں تاہم حضرت سید شرف الدین عبدالرحمٰن معروف بہ بلبل شاہؒ ترکستانی (متوفی ۷۲۷ھ) حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیان جہانگشت (متوفی ۷۸۵ھ) اور حضرت میر سید علی ہمدانی معروف بہ شاہ ہمدان (متوفی ۷۸۶ھ) جیسی شخصیتوں نے کشمیر میں اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب اور ایرانی تہذیب و

تمدن کو بھی خاصہ رواج دیا۔شاہ ہمدانؒ ایسے سات سو رفقاء کے ساتھ وارِدِ کشمیر ہوئے جو نہ صرف کشمیر میں فارسی زبان وادب کی گسترش کا سبب بنے بلکہ انہوں نے ایک نئی تہذیب وتمدن و نئے علوم وفنون بھی متعارف کرائے، جس کے نتیجے میں کشمیر حقیقی معنوں میں ایران صغیر بن گیا۔ یہاں بھی بڑے بڑے شعرا، ادیب اور مؤرخ پیدا ہوئے ۔شہمیری دور میں جو مختلف النوع تالیفات وجود میں آئی ہیں ان میں ملا احمد کی فتاویٰ شہابی، شہاب الدین بن عبدالکریم کی شفاالامراض، سلطان زین العابدین کی شکایات اور آتش بازی، منصور بن احمد کی کفایہ منصوری، سید حسین بیہقی کی ہدایت الاعمٰی، سید علی محمد کی تاریخ کشمیر، قاضی ابراہیم کی تاریخ قلمرو کشمیر اور مرزا حیدر دوغلت کی تاریخ رشیدی قابل ذکر ہیں۔جیسا کی ان کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں جن میں تاریخ کے علاوہ طب، مذہب، تصوف اور کشمیر میں آتش بازی کی روایت پر قلم اٹھایا گیا ہے۔اسی طرح چک دور میں لکھی جانے والی کتابوں میں سید علی ماگرے کی تاریخ کشمیر کے علاوہ شرح صحیح بخاری، تحفۃ المجالس، ورد المریدین، دستورالسالکین، تذکرۃ العارفین، راحت الطالبین، چلچلۃ العارفین اوررموز الطالبین جیسے کارنامے تحریر ہوئے۔

فارسی زبان وادب کے لحاظ سے مغلوں کے مرکزی دربار نے جہاں پورے ایشیاء پر اپنے اثرات مرتب کیے وہاں کشمیر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔کشمیر میں تاریخ نویسی کے بعد مذہب اور تصوف پر زیادہ تصانیف ملتی ہیں اس دور میں تو ایک طرف علوم اسلامیہ اور تصوف سے متعلق شرح صحیح بخاری، کنز الجواہر، تنبیہ القلوب، راحت القلوب، مراۃ الغیوب، ریشی نامہ، دبستان مذاہب، اسرار الابرار، نور نامہ، بحر العرفان، خوارق السالکین، فتوحات الکبرویہ اور عین العرفان لکھی گئی تو دوسری طرف تاریخ حیدر ملک، بہارستان شاہی، طبقات شاہجہانی، تاریخ اعظمٰی، تاریخ حسن، منتخب التواریخ، مجموعۃ التواریخ، تاریخ کبیر اور گوہر عالم جیسی مشہور ومعروف تاریخیں رشتۂ تحریر میں لائی گئیں۔جیسا کی ذکر ہوا ہے کی یہ تمام تصانیف نہ صرف تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا بھی آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ طب، جغرافیہ، نجوم اور فلکیاتی علوم کا بھی ذخیرہ اپنے اندر سموئی ہوئی ہیں۔مثال کے طور پر پیر غلام حسن نے اپنی تاریخ حسن میں

فلکیات کے موضوع پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"بدانکه که هفت آسمان متضمن است بر چند طبقئه دیگر و جمله آن منقسم است بر سه قسم-قسم اول- فلك حاوی یعنی وی محیط می باشد و مرکز او کرۂ زمین است-قسم دوم محیط است بر عالم اما زمین مرکز او نیست وآنرا فلك الخارج المرکز می نامند- قسم سوم فلك التدویر نام کرده اند و آن محیط عالم نیست بلکه در ضمن فلك واقع است در وسط مخصوص باالجمله هر طبقه فلك می نامند مجازاً و جمله این ها موسوم اند به فلك کلی و فلك هشتم و نهم غیر این ها است- بدانکه که در ضمن فلك کلی که طبقات دیگر مرکوز اند هر یك را گردش خود مختلف دارد و گردش تمامی آسمانها بمانند رحیٰ باشدیعنی مثل آسیا بر سر ما می گرددو یا دولابی کی مانند دولاب حرکت کنند ویاحمائلی حرکت رحوی بنظر سکان تحت اقطاب بود و حرکت دولابی نظر سکان خط استوا وحرکت حمایلی نظر سکان اقلیم متوسط این دو سمت"۔

اس کے بعد مؤرخ حسن نے تمام نو آسمانوں کے نام اوران کی مدت گردش بھی بتائی ہے۔جیسے

" آسمان اول کی آنرا آسمان دنیا و فلك القمر میگویند در یك ماه دوره تمام میکند-دوم فلك العطارد--الخ ،آسمان ہشتم که آنرا فلك البروج و فلك الثوابت و بقول اہل شرع کرسی خوانند در سی و شش ہزار سال دوره تمام می کند و تمامی ستاره غیر از سبعه سیاره در این ثابت اند -حکما این فلك را

دوازده حصه متساوی کرده اند و آن را دوازده برج می نامند ، طول ہمه برج بسمت شمال وجنوب باشد و عرض آنہا به ناحیۂ مشرق و مغرب یعنی از قطب شمالی تا قطب جنوبی راستار است ہر برج رسیدہ بمشابۂ قاشہای خربوزہ۔ پس ہر برجی بہ سی قسم منقسم می شود و ہر قسم را درجہ می خوانند۔پس فلك البروج سی صد و شصت درجہ باشد ودر ہر برجی از اجتماع چند ستارہ شکلی از اشکال واقع است آن برج بہمان شکلی مسمی شد چون حمل،سور، جوزا، سرطان،اسد، سنبلہ،میزان ،اقرب،قوس ،جدی دلو،حوت۔آسمان نہم مسمی است بفلك الافلاك و فلك الاطلس و فلك الاعظم و حرکت وی بر خلاف آسمان ہای دیگر است در این فلك ہیچ ستارہ نیست لہذا آن را اطلس خوانند"[1]۔

اس عبارت کو پڑھ کر انسان اندازہ لگا سکتا ہے کہ فارسی میں لکھی گئی تواریخ کا دائرہ کار کس قدر وسیع اور کشادہ ہے۔

کشمیر کے فارسی زبان وادب میں معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے ماضی کے کشمیر کی حالت ووضعیت اور حدود کے بارے میں جاننا کسی بھی طالب علم کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہے دیکھیے کہ پنڈت بیربل کاچرونے کس طرح ماضی کے کشمیر کی حدود کا تعین کیا ہے۔

"کشمیر جنت نظیر مطابق حساب ہئیات از جملہ اقلیم چہارمیست و عرضئہ آن طولانیست بدین موجب از حد شرقی تا جانب غربی چہل فرسنگ واز حد جنوبی تا طرف شمالی بیست و پنج فرسنگ واز جمیع جوانب خوفناك

مشتملبر جبال و کوهستان و مغاك، جنوبش بجانب ہند واقعست و کوہ شمال بصوب بدخشان و خراسان و سمت غربش بنواحی مواضعی که محل اقامت افاغنه است و طرف شرقش بمبادی اراضی تبت متصل''[۲]۔

کشمیر کے نام اوراس کی آبادکاری کے بارے میں کئی قصے بیان کیے جاتے ہیں ان میں سے جو بات کشمیر کے معتبر اسناد سے نقل ہوئی ہے اس کو نارائن کول عاجز نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

''نام کشمیر ستی سر ووجه تسمیه این است ، پاربتی که زن مہادیو است ستی ہم نام دارد از کوہ ہماچل بعرصۂ ظہور آمد و کوہ هماچل کوہیست که میوسته مملو از برف باشد ۔۔۔ از آنجا آب برف و باران درمیان جبال جمع می شد و محل انفجار نداشت، کل زمین کشمیر مشابه تالابی می نمود ۔ستی اکثر و اغلب در این تالاب سیر میکرد بنا بر آن نسبت به ستی سر موسوم گردند[۳]

عاجز (اگر چہ اس کا ماخذ کلہن کی راج ترنگنی ہے) نے کشمیر کے متعلق جو حیرت انگیز اور قابل تحقیق بات لکھی ہے وہ یہ کہ وہاں جلدیو کے نام سے ایک خوفناک دیو رہتا تھا جو خلق خدا کو آزار پہنچاتا تھا یہاں تک کہ[۶] (۳۰۶۱۵۲۰۰۰)= ۱۸۳۶۹۱۲۰۰۰ سال اسی طرح گزر گئے۔ جس کی تفصیل عاجز نے یوں لکھی ہے۔

'' تا شش منوتر که هر منوتری ہفتاد و یك دور چهار جوگ است ۔ست جوگ،ترتیا جوگ، دواپر جوگ ، کلجوگ یعنی چون این چهارجوگ که مجموع آن چهل و سه لك و دوازده هزار سال (۴۳۱۲۰۰۰)است ۔بدین تفصیل که ست جوگ هفده لك و بیست هزار سال ،ترتیا جگ دوازده

لك و نود و شش هزار سال ، دواير جگ هشت لك و شصت و چهار هزار سال ، كلجوگ چهار لك و سی و دو هزار سال ،هفتاد و يك بار ميگذرد- يك منوتر كه عبارت است از زوال سلطنت بادشاه بهشت اتفاق می افتد -بهمين منوال چهارده منوتر منقضی گردد ،يك روز عمر از عمر برهمان به آخر ميرسد -دانشوران هند شب آن روز را كلپانت می نامند "۔۴

ساتویں منوتر کے آغاز میں برہمان کا پسر زادہ جس کا نام کشب رگھیر تھا یہاں معابد وصوامع اور عابدوں کی زیارت کے لیے آتا ہے اس جگہ کی ویرانی کے بارے میں معلوم کرنے پر اسے جلدیو کی ظلم وزیادتی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خبر سن کر کشب رگھیر کے دل میں خلق خدا کے لیے ہمدردی پیدا ہوتی اور وہ جلدیو کے شر سے نجات دلانے کے لیے نوبدن کے علاقے میں ہزار سال تک عبادت کرتے رہے پھر ان کی دعا قبول ہوئی اور مہادیو وبشن و برہمان کے حکم سے سو سال تک جلدیو سے لڑتے رہے لیکن چونکہ وہ پانی میں پناہ لیتا تھا اس لیے کامیابی نہ ملی پھر ان کو یہ خیال آیا کہ جب تک پانی کو نہ نکالا جائے تب تک جلدیو پر غلبہ پانا ناممکن ہے اس لیے کشب رگھیر کے صلاح سودرشن چکر نے بارہمولہ کے نواح میں سدراہ کوہ کو اٹھالیا اور پانی باہر نکل گیا اور زمین کی سطح نمودار ہوئی اس اور جلدیو کا خاتمہ ہوا اور کشب رگھیر نے اسی وادی کو اپنا مسکن بنایا اسی کے نام پر اس کا نام کشب مر اور پھر کشمیر پڑ گیا۔

" بعد از آن ستی سر به كشب مر موسوم گرديد و بمرور از منه و تغير السنه كشب مر كشمير شد - بزعم مهره دانشوران اهل هند از هفتم منوتر بيست و هشت در گذشت و چهل و سه دور باقی مانده "-۵

اگر چہ یہ ایک فرضی کہانی معلوم ہوتی ہے تاہم وادی کشمیر کی آبادکاری کے بارے میں یہی کہانی سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے اور آج بھی سن رسیدہ لوگوں کی زبان زدہ ہے۔

زمانہ قدیم سے ہی کشمیر کے عجائبات مشہور ہیں جن میں سے وہاں کے عبادت خانے، نہریں، حوض جنگل، وادیاں اور چشموں کے بارے میں بہت ہی تعجب آور اور خارج العقل واقعات درج ہوئے ہیں مثلاً خواجہ محمد اعظم ایک چشمہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''در موضع کرمشور پرگنه یچھ چشمه ایست نزدیك تارسر و مار سردو حوض بزرگست قریب بتالاب عمقش کسی نمی داند و می گویند که در آغاز اردی بهشت که هنگام زراعت است در زمان سابق مردم با اسباب ساز و سرود در آنجا رفته بمداحی چشمه می پرداختند ،گوسفندی قربان نموده طعامی ترتیب میدادند بعد فراغ از تناول طعام آب از چشمه طلب می نمودند در عین استدعا آب جریان می یافت هر گاه از آب مستغنی می شدندباز همان دستور رفته می گفتند که آب کافی است آن چشمه مختفی میگردد۔این و حوض که مذکور شد از عجائب روزگار است بالای کوه واقع اند''[۶]۔

اسلام کی اشاعت کے بعد وادی کشمیر صوفیوں کا مسکن رہی ہے جیسا کی ذکر ہوا ہے کہ دوسرے ممالک سے صوفیائے کرام وعلمائے عظام نے کشمیر میں سکونت اختیار کی جن کی تربیت کے سبب یہاں بھی بلند پایہ صوفی پیدا ہوئے جنھوں نے شریعت، معرفت، طریقت اور دیگر اسلامی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے فارسی زبان کے ہی وسیلہ بنایا۔اس سلسلے میں اگر چہ بہت سی تالیفات کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن ملا محسن فانی سے منسوب 'دبستان المذاہب' ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جس میں مختلف مذاہب کے بارہ گروہوں کے عقاید پر فلسفیانہ اور مدلل بحث ملتی ہے جیسے کہ امور شرعی کی اصل حقیقت اور فلسفہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

''محققین صوفیه گفته اند که هر امری از امور شرعی روزه

داشتن اشارت است بطهارت درون و رویت هلال دیدن ابروی مرشد کامل و عید معرفت الله ۔ روزه را سه درجه است ،درجه اول نگاه داشتن بطن وفرج است از نا شائسته ۔درجه دوم نگاه داشتن جوارح است از اقوال و افعال نا شائسته ،درجه سوم نگاه داشتن دل است از غیر حق ، قربانی کردن اشارت است بکشتن نفس بهیمی "۷۔

اسلاف کی سرگزشت ،دینیات اور تصوف پر تالیف کی گئی کتابیں ہماری علمی وراثت ہے جس سے آشنا ہوئے بغیر اس کی حفاظت ممکن نہیں اس نقطہ نظر سے موجودہ دور میں فارسی زبان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کشمیر کی فارسی تاریخوں میں بزرگوں کے متعلق عجیب وغریب واقعات ملتے ہیں جو ہمیں فارسی مآخذوں کے علاوہ کہیں نہیں ملتے مثلاً کشمیر کے پہلے مبلغ اسلام شرف الدین بلبل کے بارے میں تاریخ کبیر میں ہے کہ:

"روزی جناب سید جانب عید گاہ بر آمدند هر گیاهی که در دشت بود بخدمت حضرت سید سلام میکرد و شیری از آن میدان هویدا گشت و نزدیك آمد و حضرت سید در گوش آن شیر حرفی خواند بعد از آن شیر در مسکن حضرت سید آمد و کسی را رنجی نرسانیدی و سر خود را زیر پای حضرت سید گذاشتی ،هر چند که آن شیر آدمی نبود اما از حق غافل نبود و آدمیت بهم رسانیده در سلك آدمیان منسلك گشت "۸۔

اگر ہم فارسی تصانیف کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں علوم کے جن مختلف شعبوں میں آج تحقیق ہورہی ہے ان کا ماخذ یہی فارسی یا عربی تصانیف ہے طب میں ابھی بھی ابن سینا کی 'قانون' علم طب ام میں الکتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ کشمیر کے فارسی دانان نے بھی

جدید موضوعات پر مستقل دستاویزات لکھے ہیں جیسے طب کے میدان میں بیاض طب از حکیم مبارک شاہ کشمیری، درامراض رأس از حکیم محمد و حکیم جعفر، مفتاح المشکلات از ہری رام خرد اور اس قبیل کے بہت سے قلمی نسخے موجود ہیں۔ اسی طرح رسلنگ کے بارے میں میر عبداللہ نے گل کشتی لکھی۔ علم پیش بینی (Forecast) اور پتھروں کی ساخت پر محمد بن مسعود المسعود دی نرواری کشمیری نے جواہر نامہ لکھا۔ اس کے علاوہ بندوق سازی، فن تیراندازی، موسیقی، علم نجوم کے مختلف درجات، حیاتیات اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار علوم وفنون پر بیش بہا خزانے قلمی نسخوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان تمام نسخوں میں مذکورہ علوم وفنون پر تفصیلی بحث موجود ہے جن سے موجودہ دور میں تحقیق کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ مختلف علون وفنون میں مستقل کتب کے علاوہ مورخوں نے تاریخ کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی مہارت کا ثبوت دیا ہے جیسا کہ دیوان کرپارام نے اپنی تاریخ 'گلزار کشمیر' میں تاریخ کے علاوہ جغرافیہ، معاشیات کے ساتھ ساتھ پھولوں، پھلوں، پیڑ پودوں، جڑی بوٹیوں، درختوں اور مسالہ جات کے طبی فوائد بھی بیان کیے ہیں مثلاً خربوزہ کے بیج کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''گرم و تر مفتح سده جگر و مدر بول و شیر و منقی مجاری گرده و مثانه و رافع تشنگی و خشونت حلق و حنجره سینه و محلل اورام حاده و اعضای باطنی و جهته سرفه گرم و تپهاء حاده و محرکه و درد سینه و ورم جگر نافع ''[9]

اس کے علاوہ بھی اس موضوع پر اخلاقی پس منظر کے حوالے سے قلم اٹھایا جا سکتا ہے۔ کشمیر میں کئی ایسے نامور شاعر گزرے ہیں جنہوں نے شعر میں اخلاقیات کے موضوع کو بیان کیا ہے۔ کشمیر کی خاک سے شیخ یعقوب صرفی، ملا محسن فانی، غنی کشمیری، مرزا اکمل، جویا، بینش، توفیق، پنڈت ست رام بقا، پنڈت گوپال کول، پنڈت ٹیکا رام آخون جیسے باوقار شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اشعار میں اخلاق کے انمول موتی پروئے ہیں۔ میرا موضوع اگرچہ تاریخ، طب یا جغرافیہ نہیں ہے تاہم موجودہ دور میں کشمیر میں فارسی زبان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ان مثالوں کا سہارا لینا ناگزیر ہے۔ آج کل جو ہمارے معاشرے میں اخلاق کا فقدان ہے اس کا واحد

حل یہی ہے کہ نوجوان نسل کو اسلاف کے کارناموں اور اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا جائے جس کا سب سے بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں موجود ہے۔ ہمارے ثقافتی ورثے کی بنیادیں فارسی زبان سے جڑی ہوئی ہیں جس زبان کی جڑیں ماضی میں اتنی گہری اور شاخیں اتنی تنوع مند ہو اس زبان کی اہمیت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔ فارسی سے نابلد شخص تاج محل، لال قلعے، مساجد، اولیاء کے مزارات کی اہمیت سے کیسے واقف ہوسکتا ہے۔ کوئی انسان فارسی سے نا آشنا رہ کر کیسے اپنے اسلاف کے کارناموں کی داد دے سکتا ہے۔ کیسے ایک مسلمان فارسی جانے بغیر ہندوستان بالخصوص کشمیر کے مذہبی دستاویزات سے استعفادہ کرسکتا ہے۔ فارسی کے بغیر کیسے ممکن ہے کہ اپنی قوم وملت کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی اور معاشی حالات سے آگاہی حاصل کی جائے۔ موجودہ زمانے میں بھی کشمیر میں بیع نامے اور نکاح نامے فارسی میں ہی ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پر ذکر و اذکار، دعاؤں اور خطبات کا کچھ حصہ فارسی زبان میں ہی ہوتا ہے۔ کشمیر میں آج بھی فارسی کے مقولے اور محاورے بزرگوں کی زبان زدہ عام ہیں۔ مساجد درگاہوں، باغات، مزاروں اور پرانی عمارتوں کے دروازوں اور کتبوں پر ان کے متعلق فارسی زبان ہی میں عبارات لکھی گئی ہیں جن کو سمجھے بغیر کوئی بھی انسان اپنی قوم اور وطن کے ماضی سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔

نتیجہ گیری:

خلاصہ کے طور پر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان و ادب میں ایسے بیش بہا خزانے موجود ہیں جن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس زبان سے آشنائی لازمی جز ہے۔ کشمیر کے فارسی ادب میں اسلامیات، تصوف، اخلاق، فلسفہ، منطق، طب، کیمسٹری، نفسیات، سیاست، جنگ، علم نباتات، علم ورزش، علم موسیقی، تاریخ اور جغرافیہ جیسے موضوعات پر لکھے گئے دستاویزات تب تک کارآمد نہیں ہوسکتے جب تک اس کے وسیلۂ اظہار سے واقفیت نہ ہو۔ فارسی زبان وادب سے دوری اختیار کرنے کے جو سنگین نتائج برآمد ہوئے اور جو نقصان ہماری تہذیب کو ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ اپنے ماضی کی شناخت، ورثے کی حفاظت اور اپنے اسلاف کے افکار کو زندہ رکھنے کے لیے ہماری فارسی سے وابستگی ناگزیر ہے۔

منابع و ماخذ:

۱۔ پیر غلام حسن کھویہامی، تاریخ حسن، شیخ غلام محمد اینڈ سنز، مائسمہ بازار سرینگر کشمیر، تاریخ اشاعت نامعلوم، ج اول، ص ۱۴۔۱۷

۲۔ کاچرو، پنڈت بیربل، مجموعۃ التواریخ، قلمی، سلیمان کلیکشن نمبر شمارہ ۶۵۷/۳۵، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۶ ب

۳۔ عاجز، نارائن کول، منتخب التواریخ معروف بہ تاریخ کشمیر، قلمی، سبحان اللہ کلیکشن نمبر شمارہ ۹۵۴/۱۳، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۵ الف، ب

۴۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ورق ۶ ب

۵۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ورق ۷ ب، ۸ الف

۶۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری، واقعات کشمیر، غلام محمد نور محمد، امیرا کدل سرینگر، تاریخ اشاعت نامعلوم، ص ۲۶۷

۷۔ فانی، شیخ محسن، دبستان المذاہب، بندر معمورۂ ممبئی، ۱۲۶۲ھ، ص ۳۲۰

۸۔ مسکین، حاجی محی الدین، تاریخ کبیر کشمیر موسوم بہ تحائف الابرار فی ذکر اولیاء الاخیار، سورج پرکاش امرتسر ۱۳۲۱ھ، ص ۷

۹۔ دیوان کرپارام، گلزار کشمیر، باہتمام سید جواد علی شاہ، مطبع کوہ نور لاہور ۱۸۷۰ء، ص ۳۱۲

جموں وکشمیر میں آزادی کے بعد اردو صحافت

ڈاکٹر نصرت بانو
اوڑی بارہمولہ، جموں کشمیر

آزادی کے بعد جموں وکشمیر جس بحرانی دور کا شکار ہوئی، اس کے اثرات صحافت پر بھی مرتب ہوے، لہذا ۱۹۴۷ء کے بعد اخبارات نکلتے اور بند ہوتے رہے، نئے اخباروں میں ''نو یگ'' شامل ہے جو ایل این تکو کی ادارت میں ہفت روزہ کی حیثیت سے شروع ہوا تھا لیکن قبائلی حملہ سے پیدا شدہ صورتِ حال مین عوام کو حالات وواقعات سے باخبر کرنے کے لیے اسے روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا، یہ اخبار ۱۹۵۰ء تک باقاعدگی کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس عرصہ میں کانگریس کے ترجمان کی حیثیت سے ''خدمت'' بھی شروع ہوا ہفت روزہ ''رنبیر'' جموں وکشمیر کے اہم اخبارات میں شمار ہوتا ہے۔ صحافی عارف عزیز کی تحقیق کے مطابق:

''اسے مہاراجہ کا حامی تصور کیا جاتا تھا، مہاراجہ کے کئی اقدامات کی اِس نے کھل کر تعریف کی لیکن ان کے غیر جمہوری کاموں پر تنقید کرنے سے بھی باز نہیں رہا، بلکہ ریاست میں ایک جمہوری حکومت کے قیام نیز ہندوستان سے اس کے الحاق کی مسلسل وکالت پر اخبار کا پورہ زور صرف ہوا، جب دیوان رام چند کاک کی قیادت میں کشمیر کو آزاد اور کچھ پہاڑی علاقوں سے ملا کر ایک وسیع تر ریاست بنانے کا تصور پیش ہوا تو ''رنبیر'' نے اس کی شدید مخالفت کی، جس کی سزا کے طور پر جون ۱۹۴۷ء میں کوئی وجہ بتائے بغیر اس کی اشاعت بند کر دی گئی، دو ماہ بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک آزاد ہوا تو اس کی اشاعت بحال ہوئی، یہ ایک تاریخی اخبار تھا''۔

جموں وکشمیر میں پریس کی آزادی تحریک حریت کی دین ہے، آزادی کے بعد صحیح معنوں میں یہاں اردو کو فروغ حاصل ہوا کیونکہ یہ ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان

اردو ہے۔ پچانوے فیصد اخبارات اردو میں شائع ہوئے۔نندلال واتل اپنے تحقیقی مضمون میں آزادی کے بعد جموں وکشمیر کی اردو صحافت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیانی وقفہ میں جموں اور سرینگر سے کئی نئے اخبارات جاری ہوئے جن میں سے چند زندہ ہیں، باقی کسی نہ کسی وجہ سے بند ہو گئے۔۱۹۴۸ء میں جموں سے ''نیا کشمیر'' نام کا ہفتہ وار اخبار جاری ہوا، مرحوم سید نذیر حسن سمنانی اس کے بانی اور ایڈیٹر تھے، یہ اخبار بھی بند ہو گیا، وید گپتا نے اخبار ''سویرا'' جاری کیا جو ۱۹۵۳ء تک جاری رہا۔ ''دیش سیوک'' گنگا ناتھ نے جاری کیا، لیکن اس کی عمر بھی محدود رہی۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں کئی اردو اخبار جن میں ''نیا سماج''، ''لوک راج''، ''انقلاب''، ''نوائے قوم''، ''اجالا''، ''شیر ڈاگر''، ''جے سودیش''، ''مساوات''، ''خورشید''، ''دیپک''، ''چاند''، ''حقیقت''، ''چٹان''، ''شاردا''، ''پنتھ سیوک''، ''اکال یودھا''، لوک سندیش''، ''جموں پٹریکا''، ''سنگم''، ''سندیش''، ''قومی آواز''، ''اجالا''، ''چاند''، باقاعدہ گی سے شائع ہوتے رہے۔ جموں میں اس وقت تقریباً ایک درجن روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ہفتہ وار اخباروں کو ملا کر ان کی تعداد تقریباً ۷۵ ہے اور سب سے پرانا اخبار روزنامہ ''خدمت'' ہے جو جموں و کشمیر پردیش کانگریس کا ترجمان ہے۔ دوسرے روزنامہ اخباروں میں ''آفتاب''، ''سرینگر ٹائمز''، ''ہمدرد''، ''سری نگر ایکسپریس''، ''مارننگ نیوز''، ''دلیر''، ''زمیندار''، ''مارننگ ٹائمز''، ''نوائے صبح''، ''آئینہ''، ''نوجیون'' وغیرہ شامل ہیں۔ ہفتہ وار اخباروں کی تعداد بھی کافی بڑی ہے۔

ایک ''نوائے صبح'' اور دوسرا ''مارتنڈ'' سری نگر سے آفسیٹ پر چھپتے ہیں اور گیٹ اپ کے لحاظ سے ملک کے دوسرے اچھے اخباروں کے ہم پلہ ہیں۔ اگر چہ دوسرے روزناموں کی طرح اِس مین بھی زیادہ تر جموں وکشمیر سے متعلق خبریں ہی شائع ہوتی ہیں تاہم یہ ملک کی عوخبر رساں ایجنسیوں پی ٹی آئی سے بھی خبریں حاصل کرتے ہیں اور ان کے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر لگے ہیں، باقی اخبارات بدستور لیتھو مشینوں پر چھپتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی: آزادی کے بعد جموں وکشمیر میں اردو صحافت رو بہ ترقی ہے''۔

آخر میں سرینگر سے شائع ہونے والے دو اہم اخبارات کا ذکر ضروری ہے جو طویل عرصہ سے شائع ہو رہے ہیں۔ پہلا ہفت روزہ ''رہبر'' ۱۹۳۲ء سے نکل رہا ہے، اس کے بانی مرحوم

خواجہ غلام محی الدین رہبر ہیں۔ اِسے ہندوستان کا سب سے قدیم اخبار قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا لیکن درمیان میں کئی سال بند رہ کر ۱۹۶۴ء میں اِسے دوبارہ شروع کیا گیا، فی الحال محی الدین، رہبر '' نکال رہے ہیں۔ دوسرا روزنامہ ''روشنی'' ہے، یہ اخبار ۱۹۴۲ء سے نکل رہا ہے، اس طرح اپنی اشاعت کے ۷۷ سال مکمل کرنے والا ہے، روزنامہ ''روشنی'' سری نگر کے بانی اور ایڈیٹر عزیز کشمیری ہیں جب کہ پرنٹر پبلیشر زیڈ اے شورا اور ایگزیکٹو ایڈیٹر این احمد ہیں، معتدل پالیسی پر گامزن اس اخبار نے ۱۹۵۳ء کے بعد ''رسول نمبر'' اور ''حضرت عیسیٰ'' نمبر نکالے جو کافی مقبول ہوئے۔

بحیثیت مجموعی ریاست جموں وکشمیر اردو اخبار کی تعداد اشاعت کے لحاظ سے پورے ہندوستان کی پیش رو ریاست ہے، آزادی کے بعد اس ریاست نے پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی، پنڈت کشپ بندھو اور شمیم احمد جیسے صحافی اردو دنیا کو دیے، خاص طور پر شمیم احمد کی ادارت میں ''آئینہ'' جو پہلے ہفت روزہ تھا، بعد میں روزنامہ ہوا، عوام میں اِس اخبار نے کافی مقبولیت حاصل کی، شمیم مرحوم جموں وکشمیر اسمبلی کے ممبر ہی نہیں بنے، پارلیمنٹ میں بھی انھوں نے اپنی ریاست کی نمائندگی کا فرض ادا کیا۔ ان کی تحریروں نے ''آئینہ'' کو وسیع حلقے میں مقبول بنا دیا تھا۔ افسوس کہ شمیم صاحب کے بعد یہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس جو نئے اخبارات جاری ہوئے ان میں غلام نبی خیال کا ''اقبال''، رشید تاثیر کا ہفتہ روزہ ''محافظ''، عبدالرحمٰن آزاد کا ''چشمہ''، طاہر ہمدانی کا ہفت روزہ ''نیا دور''، فاروق انرانی کا ''انڈین ٹائمز''، بشیر نوشاہ کا ''مارننگ ٹائمز''، عبدالرحمٰن میر کا ''سری نگر ایکسپریس''، نذیر احمد کا ''جہلم'' قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں سماجی واخلاقی مسائل کی عکاسی

ڈاکٹر تسنیمہ پروین
اسسٹنٹ پروفیسر، ڈورنڈہ کالج، رانچی

ملخص

جب سے خواتین افسانہ نگاروں نے ادب کی دنیا میں قدم رکھا ان کا واسطہ نت نئے مسائل کے ساتھ تھا سب سے بڑا مسئلہ پردہ کا مسئلہ تھا عورتوں کا بولنا بھی، لکھنا بھی اس وقت ایک بڑی بات تھی شروعاتی دور میں خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے نام کے بجائے دوسرے ناموں سے لکھا جیسے منر عبد القادر، محترمہ زیڈ بی، بنت باقر وغیرہ ایسے وقت میں جب خود اپنے شناخت کا مسئلہ رہا ہو عورتوں کو انصاف دلانے اور ظلم وستم سے نجات دلانا ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن خواتین افسانہ نگاروں نے ان دشواریوں سے گزرتے ہوئے ادب کے میدان میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کیا۔ زمانے کے تغیرات کے ساتھ مسائل میں بھی تبدیلی آئی۔ ان افسانہ نگاروں نے ہر مسئلہ پر اپنی کہانیوں کے ذریعہ سماجی بیداری کی کوشش کی اخلاقی قدروں کی پامالی پر توجہ مرکوز کرائی کوئی بھی زمانہ ہو اس کے اپنے تقاضے اور مسائل ہوتے ہیں چاہے وہ سماجی مسائل ہوں یا پھر اخلاقی مسائل وہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اپنا روپ بدلتے ہیں لہٰذا یہ تبدیلیاں ہی فنکاروں کو نئے نئے تجربات کرنے پر آمادہ کرتی ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور کا بنیادی مسئلہ تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے کل بھی عورتوں پر ظلم ہو رہے تھے آج بھی مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ ہاں وقت کے ساتھ انداز میں ضرور تبدیلی آئی ہے۔ چونکہ عورتیں عورت کے دکھ درد سے زیادہ واقف ہوتی ہیں اس لیے جب ان خواتین افسانہ نگاروں نے لکھنا شروع کیا تو اردگرد اطراف واکناف کے مسائل پر ہی لکھنا شروع کیا اور ان مسائل کو اپنے افسانوں

کا موضوع بنایا۔آج ایکسویں صدی میں عورتوں کو الگ قسم کی پریشانیوں سے واسطہ ہے۔اس لیے آج کی قلم کار عصری مسائل کے ساتھ عورتوں کے مسائل پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔

☆☆☆

ادب زندگی کا آئینہ ہے اور اس آئینہ میں زندگی کے اخلاقی قدروں کو من وعن دیکھا جا سکتا ہے۔ادب کا رشتہ سماج سے گہرا ہوتا ہے۔سماج اور معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کی عکاسی کا بہترین ذریعہ ادب ہے زندگی تغیر پذیر ہے اگر زندگی میں تبدیلیاں رونما ہونگی تو اس کے اثرات ظاہری طور پر سماج میں بھی پڑیں گے کیوں کہ ادب کا سماج سے براہ راست رشتہ ہوتا ہے۔کوئی بھی زمانہ ہو اس کے اپنے تقاضے اور مسائل ہوتے ہیں چاہے وہ سماجی واخلاقی مسائل ہوں یا معاشی واقتصادی مسائل وہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اپنا روپ تو بدلتے ہیں لہٰذا یہ تبدیلیاں ہی فنکاروں کو نئے نئے تجربات کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔اس لیے ادب کی ہر صنف میں یہ مسائل نئے روپ میں نظر آتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور کا بنیادی مسئلہ تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے چونکہ ادیب سماج کا ایک حصہ اور ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو حساس ہوتا ہے وہ ان مسائل کو ضبط تحریر میں لاتا ہے جو ان کے اردگرد رونما ہوتے ہیں۔وہ ان سب چیزوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور ان گوشوں کو ابھارتا ہے جن سے عام لوگوں کی زندگی متاثر ہوتی ہے خصوصاً خواتین افسانہ نگاروں نے ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی جو اس وقت کے اہم مسائل تھے جیسے تعلیم نسواں،لڑکیوں کی کم سنی میں شادی کے مضر اثرات،بیوہ کی بد سے بدتر حالات اور مشرقی عورتوں کی روایتی وفاداری اور پردہ وغیرہ۔

افسانے کے موضوعات اکثر سماج کے سماجی واخلاقی مسائل رہے ہیں۔افسانے نے انسانوں کے دکھ درد زندگی کے اتار چڑھاؤ سبھی کچھ اپنے اندر سمیٹ لیا افسانہ نگاروں نے نہ صرف ان مسائل کو پیش کیا بلکہ معاشرے کی برائیوں اور ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اگر ہم ابتدائی دور کا ذکر کریں تو دیکھتے ہیں کہ اس دور میں تعلیم کا رواج کم تھا۔بدعقیدگی زیادہ تھی بیٹیوں کو معاشرے میں بوجھ سمجھا جاتا ہے اور بیٹی پیدا ہونے پر بہو کو منحوس سمجھا جاتا تھا اور گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔بیٹیوں کو پیدائش کے بعد مار دیا جاتا تھا ان تمام سماجی واخلاقی تنزلی کو افسانہ نگاروں نے بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا اور اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

خواتین افسانہ نگاروں کا سفر 1927ء سے شروع ہوتا ہے جس کے ثبوت کے طور پر تہذیب نسواں، عصمت اور نیرنگ خیال جیسے اپنے دور کے مقبول عام جرائد 1927ء اور اس کے بعد کے شماروں کو پیش کیا جاسکتا ہے عظمت النساء بیگم کا افسانہ پاؤں میں زنجیر، ماہنامہ عصمت کے جولائی 1927ء کے شمارے میں شامل تھا۔ اس کے بعد سیدہ فضل فاطمہ بیگم کا افسانہ فرزانہ بیٹی، مسز یوسف الزماں کا افسانہ 'سونا' اور رضیہ ناصرہ کا افسانہ 'سودائے خام' نومبر 1927ء کے شمارے مین شائع ہوا۔ اس دور کی ادیباؤں میں رشیدۃ النسا، اکبری بیگم، منر عباس طیب جی، صغریٰ ہمایوں، بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر، نذر سجاد حیدر اور حجاب امتیاز علی وغیرہ چند اہم نام ہیں جن کے یہاں اصلاحی و اخلاقی مسال ، سماج میں پھیلے برے رسم ورواج کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ آگے چل کر ان افسانہ نگاروں کے یہاں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے ان گوشوں کو بھی بے نقاب کیا جن پر قلم اٹھانا اس زمانے میں بڑی بات تھی اس دور کی ایک اہم افسانہ نگار نذر سجاد حید نے سماجی اور اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھکر حصہ لیا۔ نذر سجاد نے ایسے وقت میں جب شریف خواتین کی آواز کا بھی گھر سے باہر سنائی دینا جرم سمجھا جاتا تھا انھوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ خواتین کو ایک ایسی زندگی جینے کی دعوت دی جس پر صدیوں تک مردوں کی حکمرانی رہی تعلیم نسواں کی مخالفت، پردے کی قید و بند، تعداد ازدواج وغیرہ رسومات مسلم معاشرہ کا حصہ بنے رہے ان رسومات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور ادب کے ذریعہ عوامی شعور بیدار کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ جن ادیبوں نے اس قلمی محاذ کا بیڑھ اٹھایا ان میں نذر سجاد حیدر بھی تھیں ان کے دوسو سے زیادہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

نذر سجاد حیدر کے بعد جو اہم نام ہمیں نظر آتا ہے ان میں حجاب امتیاز علی کا ایک انفرادی مقام ہے۔ اپنے اسلوب، موضوع، واقعہ کی نوعیت اور کرداروں کے لحاظ سے خواتین افسانہ نگاروں میں کوئی ان کے مقابلے میں نہیں رکھی جاسکتی۔ خواتین اردو ادب کا یہ پہلا دور انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کی تیسری دہائی پر محیط ہے۔ ان کی تخلیقات خانگی، سماجی و اخلاقی مسائل سے ان کی آگہی اور ان کی عکاسی ان کے افسانوں کا اہم موضوع رہا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں کا دوسرا اور اہم دور بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے شروع ہوتا ہے ڈاکٹر رشید جہاں اس دور کا اہم نام ہیں انھوں نے 1930ء کے قریب لکھنا شروع کیا

انگارے میں ان کی دو کہانیاں دلی کی سیر اور پردے کے پیچھے نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیا۔ رشید جہاں 1926ء میں ڈاکٹر ہوئیں اور دہلی کے متوسط طبقہ کے رہائشی علاقے میں پریکٹس شروع کیں اس دوران ان کا سابقہ ایسی خواتین سے ہوا جو نسوانی امراض کی پوٹلیاں تھیں۔ جن کی زندگی دکھ جھیلنے ساس نند کے طعنے سننے اور میاں کی جنسی خواہشات پورا کرنے میں گذر رہی انھیں دیکھ وہ مشتعل ہوا ٹھیں اور پھر مسلم معاشرہ کے خلاف اپنا قلم بلند کیا ان کا افسانہ پردے کے پیچھے گھٹے گھٹے پر عفونیت ماحول میں زندگی بسر کرنے والی خواتین کی المناک زندگی اور مرد کی ہوسنا کی کے جاندار نقش ابھارے گئے ان کے افسانہ دلی کے سیر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مجھے اسباب پاس چھوڑ یہ رفو چکر ہوئے اور میں اسب پر چڑھی برقعے میں لپٹی بیٹھی رہی، ایک تو کم بخت برقعہ، دوسرے مردودے۔ مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں۔ اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکر لگاتے ہیں پان کھانے کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آواز کسے اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جائے۔''1

رضیہ سجاد ظہیر اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے ایسے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جن کا تعلق سماج کے پسماندہ عوام اور کمزور طبقے سے تھا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں متوسط گھریلو زندگی کی عکاسی کی رضیہ سجاد ظہیر کے بعد ہم عصمت چغتائی کے افسانوں میں بھی متوسط طبقے کی نوعمر لڑکیوں کی جنسی بیداری اور اس سے پیدا ہونے والی الجھنوں کو پیش کیا ساتھ ہی انھوں نے ہندوستانی عورت کی محکومی، مظلومی و شدید بے چارگی کا نقشہ بہت خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ عصمت کا ایک افسانہ باندی جس میں بڑے بھائی افضل میاں کو جب پتہ چلتا ہے کہ چھمن میاں لونڈیوں کے نام سے ہی لعن طعن بکنا شروع کر دیتے ہیں تو انہیں مذہب کا حوالے دے کر سمجھانے آتے ہیں گفتگو ملاحظہ ہو:

''بکواس مت کیجیے ایسی کوئی بات نہیں اصل میں مجھے ایسی باتیں پسند نہیں، میرا مطلب ہے بغیر نکاح ناجائز ہے۔''

''مگر سرکار باندی تو جائز ہے۔''

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمارے جدامجد سب کے سب حرام کار تھے۔ایک آپ پیدا ہوئے ہیں متقی پرہیز گار''

''میرا خیال ہے کہ---''

''آپ کا خیال سالا کچھ نہیں، کبھی ارکان دین کا مطالعہ فرمایا ہے؟''

''نہیں تو مگر----یہ بات عقل میں نہیں آتی۔''

''پتھر پڑ گئے ہیں آپ کی عقل مبارک پر''

مگر قانوناً جرم ہے۔''

''ہم یہ کافروں کے قانون کو نہیں مانتے، ہم خدا ذوالجلال ولکرام کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔تمہاری مرضی تم کو جگ ہنسائی کا شوق ہے تو کون روک سکتا ہے۔''

''جہالت سب جہالت کی باتیں ہیں۔''

''ہمارے قبلہ وکعبہ جاہل تھے۔''

''ہوں گے مجھے کیا پتہ۔''

''ابے کیوں گھاس کھا گئے ہو---بزرگوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی رواج بنایا اب تک ہمارے خاندانوں میں اسی پر عمل ہوتا چلا آیا ہے جوان لڑکے بے راہ نہیں ہوتے بری لتوں سے بچتے ہیں صحت اچھی رہتی ہے۔''

''یہ سب حرام کاری کو جائز بنانے کے ہتھکنڈے ہیں۔''

''تم کفر بک رہے ہو۔۔۔مذہب کے توہین۔''

''ارے جایئے بڑے مذہب والے آئے مذہب کی بس ایک ہی بات دل پر نقش ہے۔'' 2

ان مکالموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مذہب کے نام پر برائیاں اور استحصال عام تھا۔ جہالت کی انتہا تو یہ کہ حرام کاری کو بھی مذہب کی آڑ میں جائز قرار دے دیا گیا تھا۔

عصمت کے افسانے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی زندگی، مذہبی عقائد، توہمات وغیرہ کا بیانیہ ہیں جن کا موضوع جنس ہے عصمت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جنسی

عریانیت کے باوجود اپنی کہانیوں مین ایک گہری سوچ اور فکر کے عناصر کو پیش کیا۔

صالحہ عابد حسین بیسویں صدی کی ایک ذہین فنکارہ ہیں ان کی کہانیاں اخلاقی، معاشرتی اور اصلاحی نقطہ نظر کے غماز ہیں۔ رسم ورواج گھریلو زندگی کی پراثر مصوری ان کے افسانوں کا خاصہ ہیں صالحہ کے کردار ایسے فرد ہیں جو طبقاتی کشمکش اور سماجی استحصال کا شکار ہیں چاہے وہ 'لوٹ' کے کردار ہو 'اللہ رکھے' یا پھر 'ماں کی ممتا'' کے ان کردار ونکی اکثریت نسوانی کرداروں کی ہے جو مظلومیت کا مرقع ہیں۔

جیلانی بانو اردو کی وہ منفرد اور حساس افسانہ نگار ہیں جنھوں نے طبقہ نسواں کے اندر بیداری پیدا کرنے کی کوشش کیں۔ ان کی کہانیوں میں جہاں عورتوں کا استحصال نظر آتا ہے وہیں عورتوں کا باغیانہ روپ بھی دکھائی دیتا ہے مثال کے طور پر ان کا افسانہ ''راستہ بند ہے'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں اب وہاں جاؤں گی، ہمارا گھر توڑ دیے، ساماں پھینک دیے، کیا ہم سڑکوں پر رہیں گے اب؟ میں وہاں جا کر پوچھوں گی جہاں انصاف ہوتا ہے ۔۔۔؟ بوڑھی عورت زور زور سے رونے لگی۔۔۔۔ گیٹار والے لڑکے نے اسے تھام لیا۔
>
> آپ کے لیے وہاں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے ماں جی جہاں انصاف ہوتا ہے آگے راستہ بند ہے۔'' 3

جیلانی بانو نے اپنے افسانوں میں انسانوں کے حق وانصاف کے لیے آواز بلند کی ہے۔

ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں وہ خاموش جذبات بولتے نظر آتے ہیں جو دبی کچلی عورتوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں وہ عورت کو مردوں کے دوش بدوش دیکھنے کے مدعی ہیں ان کے دو حوالے ہیں ایک جنس اور دوسرا پیٹ کی بھوک۔ سماجی زندگی اور انسانی فطرت پر جس طرح کا طنز انھوں نے کیا وہ قابل ستائش ہے۔ مثلاً

> ''کئی اپنے شوہروں کی نظر میں- پرانا گھسا ہوا فال ہو کر، مائیکے میں پڑی تعویذوں اور پیر صاحبان کے عملیات کے ذریعے ۔۔۔ اپنی پھٹی پرانی جوانیاں رفو کرا رہی تھیں ۔۔۔'' 4

ہاجرہ مسرور نے عورت کے حوالے سے اس معاشرے کو دیکھا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ معاشرے میں سماجی معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی وجہ سے عورت گھٹن کا شکار ہے۔

خدیجہ مستور نے سماج میں طبقاتی جدوجہد کی اہمیت کو سمجھا انھوں نے عورتوں کی مظلومیت کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اپنے افسانوں میں اس کا ذکر بھی کیا۔ ان کی کہانیوں میں معاشرے کے غریب لوگوں کے تئیں ہمدردی ظاہر کی گئی ہے انھوں نے شر کے خلاف خیر کے حق میں اپنی آواز بلند کی ہے مظلوم انسانوں کی سوئی ہوئی قسمت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

کسی بھی صداقت میں گہرائی و گیرائی رہنی چاہیے موجودہ دور میں ادب مقاصد اور اخلاق کی تعلیم براہ راست نہیں دیتا وہ حقیقت کو الگ زاویہ نظر سے پیش کرتا ہے قرۃ العین حیدر اردو کی وہ افسانہ نگار ہے جنھوں نے اپنے افسانے کے ذریعہ ایک نئی سوچ عطا کی وہ جانتی تھی کہ اخلاق زمانے کے مطابق بدلتا رہتا ہے ہر زمانہ اور ہر تہذیب کے اخلاقی اصول الگ ہوتے ہیں جب کوئی زمانہ بدل جاتا ہے تو نہ صرف اس زمانے میں افراد دوسرے آجاتے ہی بلکہ مروجہ اخلاقی قانون وضابطہ میں بھی تغیرات ہوجاتے ہیں اس طرح پھر ضرورت کے مطابق نئے اصول وضع کیے جاتے ہیں اور یہ لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے قرۃ العین حیدر افسانہ نگاری کا گہرا علم رکھتی ہیں اور ان کی یہ خواہش تھی کہ افسانہ جدیدیت کے اصولوں کے مطابق لکھی جائیں اور ان میں کوئی خامی نہ رہیں اس پیس منظر میں ممتاز شیریں، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، خالدہ حسین، فہمیدہ ریاض اور زاہدہ حنا کو قرۃ العین حیدر کی روایت کا امین اور شکیلہ اختر، ہاجرہ مسرور جیلانی بانو، صغریٰ مہدی، بشریٰ رحمٰن اور واجدہ تبسم کو عصمت چغتائی کی جانشین قرار دیا جاسکتا ہے۔

معاصر خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی روایت کی توسیع کی اس ضمن میں دو افسانہ نگار خواتین کا بیک وقت نام لیا جاسکتا ہے ایک ذکیہ مشہدی اور دوسری ترنم ریاض اس تہذیبی وثقافتی سیاق وسباق میں ان کے کردار کبھی اجتماعی قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں اور کبھی انفرادی قدروں کی مگر انسانیت پر سے ان کا اعتماد کبھی متزلزل نہیں ہوتا تہذیبی اور ثقافتی مسائل کو کرداروں کے روپ میں پیش کردینے کے ہنر سے یہ واقف ہیں۔

1960ء سے لے کر 2018 کے درمیان ایک طرح سے تین پیڑھیاں شانہ بہ شانہ مسلسل

عمل پیراں ہیں جنھوں نے آج کے عہد کی بہت خوبصورتی سے عکاسی کی ہی آج کے عہد کے مسائل میں بہت تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں رشتے ناطے کمزور پڑ گئے فحاشی جسم فروشی، غیر اخلاقی افعال، قتل وغارت گری دہشت گردی، فرقہ وارانہ فسادات، انسانیت کا قتل، بربریت کا ننگا ناچ وحشت درندگی اور دولت کے حصول کے لیے ہر جائز ناجائز طریقے استعمال میں آنے لگے ہیں انسانی قدریں اتنی تیزی سے زوال پذیر ہورہی ہیں کہ انسانیت ششدر ہیں بیسویں صدی نے اکیسویں صدی کے سفر میں افسانے میں موضوعات یکسر بدل گئے سماجی قدروں کا فقدان اور اخلاقی اقدار کی تنزلی آج کے عہد کے چیلنجز ہیں اکیسویں صدی میں جہاں رشتوں کی نوعیت بدلی ہے وہیں رشتوں میں مکمل سپردگی، ایمانداری اور وفاداری کا بھی قحط پڑا ہے نئے عہد کے یہ رشتے کہیں انسانیت کو شرمندہ کررہے ہیں تو کہیں رشتے عورت کی بکھرتی زندگی کو سنوار رہے ہیں رشتوں کے اس تضاد کو بے حد خوبصورتی کے ساتھ غزال ضیغم نے اپنے افسانہ ''زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں، میں پیش کیا ہے۔ نگار عظیم کا افسانہ حصار صبیحہ انور کا افسانہ 'واپسی' قمر قدیر ارم کا افسانہ ''موسموں کی خوشبو' ہاجرہ مشکور کا افسانہ رشتوں کے جنازے، تسنیم فاطمہ کا افسانہ آدھا چاند، رخشندہ روحی کا افسانہ مسز کاظمی، کہکشاں پروین کا بدذات وغیرہ ایسے نئے اردو افسانے ہیں جن میں رشتوں کا بدلتا معیار ابھر کر سامنے آرہا ہے۔

مذکورہ افسانہ نگاروں کے علاوہ بھی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ جنھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی و اخلاقی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ اردو افسانہ کی موجودہ صورت حال دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی آوازوں کی آمد سے نئے امکانات روشن ہوئے ہیں معیار بلند ہوا ہے، نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ 1960ء سے لے کر 2018ء کے دوران اردو افسانے میں جدیدیت کی ایک نئی لہر آئی ہے جسے جدید ادیبوں سے فروغ حاصل ہوا۔ ان میں اشرف جہاں، مہہ جبیں نجم، شبانہ رضوی، فرحت جہاں کوثر جہاں، افشاں ملک، انور نذہت، کہکشاں پروین، کوثر پروین، ذکیہ ظفر، شمیم نکہت، ناصرہ شرما، زیب النسا، رفعت جمال، غزالہ قمر اعجاز، رخشندہ روحی، قمر جمالی، نسرین ترنم، فریدہ بانو، نوشابہ خاتون، حسین جبین، روشن آرا، ناظمہ زبیں، خلیق النساء، بتول فاطمہ، نصرت شمسی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

آج ہمارے سامنے کئی سماجی واخلاقی مسائل ہیں بعض مسائل روپ بدل کر ہمارے سامنے

آئے تو بعض نئے ہیں۔آج بھی کسانوں کا حال ابتر ہے سماجی اور طبقاتی کشمکش نے فرقہ واریت کا روپ اختیار کرلیا ہے بے روزگاری آج کا سب سے بڑا المیہ ہے، تعلیم یافتہ طبقہ بے راہ روی کا شکار ہو چکا ہے۔عورتوں کی عصمتوں کے تحفظ کا مسئلہ ہے سوشل میڈیا نے ایک جال بچھا رکھا ہے جس سے نوجوان نسل میں اخلاقی قدروں کی پامالی ہنور میں ہے اکثریتی طبقہ ہر ممکن طریقہ سے اقلیتی طبقہ کو کچلنے کے نت نئے تدابیر میں لگا ہوا ہے۔اس کے علاوہ کرپشن اور تشدد بھی عالمی مسئلہ بن چکا ہے جس کا سد باب اور تدارک ممکن ہی نہیں سائنس اور ٹکنالوجی نے دنیا کو ایک کالونی میں بدل دیا ہے۔مل مالکوں اور مزدوروں کی جگہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالکوں اور ملازمین کے مسائل نے لے لی ہے کیونکہ تعلیم یافتہ نوجوان دن رات محنت کر کے مالکوں کی حرص کو پوری کر رہے ہیں۔آسائش کی خواہش نے نوجوانوں کو مشین بنا دیا ہے۔رشوت خوری کا تانڈو ہر طرف جاری ہے۔حکمرانوں کی نئی نئی چالوں اور حرکتیں نا قابل برداشت ہو رہی ہیں ۔آج کے خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں عورتوں کے دکھ درد ہی نہیں عصری مسائل کا خوبصورت اور فنکارانہ بیان بھی ہوا ہے یہ خواتین افسانہ نگار نسبتاً زیادہ بیدار مغز اور عالمی حالات و واقعات پر نظر رکھے ہوئے ہیں نکسلی تحریر، چائلڈ لیبر، اولڈ ایج ہوم اور سیکس وغیرہ جیسے سماجی واخلاقی مسائل آج کے موضوعات ہیں جن پر کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔آج کی تیز رفتار زندگی میں جو سماجی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور رشتے کے ٹوٹنے بکھرنے کا عمل جاری ہے ان پر بھی ان کی نظر صاف ہے مگر یہ بھی بہت واضح ہے کہ خواتین نے فوقیت عورتوں کے مسائل کو ہی دی ہے اور عورتوں کی نفسیات اور سماجی ناانصافیوں کو عورت کے نقطۂ نظر ہی سے پیش کیا ہے ہر افسانہ نگار کے یہاں عورت کی سماجی حیثیت کے تعلق سے ایک احتجاج ملا ہے۔

☆☆☆

حواشی:

1۔افسانہ دلی کا سیر، سہ ماہی لوح وقلم جون تا دسمبر، ص 157

2۔عصمت چغتائی کے افسانے، افسانہ باندی، ص 131-130

3۔اردو کی خواتین فکشن نگار۔مرتب مشتاق صدف، ص 88

4۔ہاجرہ مسرور

مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی خدمات

ڈاکٹر واثق الخیر

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر، تاریخ ادب اردو

مولانا ابوالکلام آزاد بیسویں صدی میں اسلام کے سب سے بڑے شارح، ترجمان، مذہبی مفکر اور دینی مبلغ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنے اجتہادی فکر سے ہندوستانی مسلمانوں کو نئی جہتیں عطا کیں جس کی وجہ سے آزادی کے بعد رونما ہونے والے مختلف سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، تعلیمی واقعات اور حالات سے نبرد آزما کے لیے راہیں کھلیں۔ وہ اپنی تمام تر سیاسی وسماجی مصروفیات کے باوجود قرآن وحدیث، منطق وفلسفہ کی روشنی میں مسلمانان ہند کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کا بڑا انوکھا اور بہت اہم کام یہی تھا کہ انہوں نے اسلام کی روح کو زمانے کی روح کے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ وہ مثبت، ترقی پسند اور صحت مند قدروں کو مثلاً جمہوریت، قومی اتحاد، سیکولر سماج، عالمگیر انسانیت، بنیادی انسانی حقوق اور آزادی ملک وقوم کو اسلامی سیاسی نظریہ کے مطابق برتتے رہے۔ مولانا آزاد کے سوچنے کے سانچے مذہبی اور اسلامی تھے۔ وہ انسانی معاشرت کو مذہبی کسوٹی پر ہی پرکھتے تھے اور سیاسی مطمح نظر کی بنیاد اسلامی اصول پر رکھتے تھے۔ ان کی فکر اور عمل کو اگر مذہب اور اسلام کے دائرہ سے جدا کر کے دیکھا جائے تو بہت سے مفروضے اور محرکات سمجھ میں نہیں آئیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بیسویں صدی میں بین الاقوامی دور کے تقاضے کو سمجھ رہے تھے اور اس وقت اسلام کی افادیت کو تسلیم کرانے کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے۔ مولانا سے اللہ تعالی نے یہ اجتہاد کرایا کہ جن ملکوں یا جن مقامات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی لین دین اور معاملات میں اعتماد قائم ہے اور یہ لوگ آپسی اعتماد کے سبب امن وامان اور آرام وسکون سے رہتے ہیں کبھی بھی کسی

بھی مسئلہ یا معاملہ کے پیش نظر بدلہ لینے کی کوشش نہ کریں کیوں کہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کو ان کی جہالت کی زندگی سے نکالنا اور شرعی نظام کے تحت ان کی زندگی میں ضبط و اتحاد پیدا کرنا تھا۔ اس کے لیے مولانا نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت اہم ہے۔ ان کا خیال بالکل درست تھا کہ مسلمانان ہند ایک نظام شرعی کے تحت مجتمع ہو جائیں اور معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی مسائل کے حل کے لیے اپنی تمام طرح کے وسائل کو استعمال میں لا کر اپنی زندگی کو بہتر بنائیں۔ زکوٰۃ کا نظام قائم کر کے اپنی معاشی زندگی کو مستحکم بنیادوں پر استوار کر لیں۔ اپنے اندر اصلاح اور 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا نظام قائم کر کے اپنی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو ان لوگوں سے بچائیں جن کے لیے انہیں وقت کی عدالتوں میں رسوا ہونا پڑتا ہے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ مسلمان اپنا ایک نظام عدل خود قائم کر لیں اور آپس کے چھوٹے موٹے جھگڑوں اور اختلافوں کو سلجھا لیا کریں۔

مولانا آزاد بیک وقت مذہب، فلسفہ، صحافت، سائنس اور عصری مسائل پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ انہوں نے اپنے دور میں جو بھی مضامین لکھے ان میں سے زیادہ تر مضامین اسلام کی صداقت ثابت کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کا مذہبی اور اسلامی تصور، سیاسی اور مذہبی تحریریں ماضی اور حال کے تجربات کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کی فکرمندی سے عبارت ہے۔ ان کے نزدیک مغرب یا غیر مسلموں سے تہذیب و معاشرت اور سیاست کے سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ قرآن کی اتباع اور اسے مشعل راہ بنانا ضروری ہے۔ آزاد کے وحدت ادیان، مشترکہ ہندوستانی تہذیب و قومیت کے تصورات اسی فکر کے مظاہر ہیں۔ چونکہ مولانا آزاد روایتی تقلید کی زنجیروں سے آزاد تھے اور اپنے مشاہدہ، تجربہ اور نتائج کی بنیاد پر ہمیشہ چلے۔ اسی بنیاد پر ابوالکلام آزاد نے اپنے تمام مذہبی، تہذیبی اور سیاسی زاویہ ہائے نظر کی بدلی ہوئی پالیسی پر عمل کر کے مثبت مذہبی قدروں کے فروغ کی بنیاد ڈالی اور اس طرح وہ اسلام کے حقیقی روپ کی طرف گامزن ہو گئے۔ ان کے نزدیک مذہب کا حقیقی روپ راہ عقل و ادراک سے نہیں بلکہ خالص اور بے میل جذبات سے طے کی جاتی ہے۔ ان کا مقصد مذہب کے اس روپ کو سچا بتانا ہے جو انسان کے دل میں بلا واسطہ منعکس ہوتا ہے جو اپنی صداقت کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہیں

رہتا۔آزاد کے نزدیک اپنے معاشرے کو بدلنے کا مطلب صرف سماجی اصلاح نہیں بلکہ مجموعی ذہنی وتہذیبی تبدیلی کا نام ہے۔مولانا آزاد کے نزدیک ''دین حق کا ماحصل'' مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصور۔اس لیے کہ انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں۔صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔

۲۔قانون مجازات کا اعتقاد۔یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے،اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں۔ نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے،برے کا برائی۔

۳۔معاد کا یقین۔یعنی انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہوجاتی،اس کے بعد بھی زندگی ہے۔اور جزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

۴۔فلاح وسعادت کی راہ اور اس کی پہچان۔[۱]

مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کریم کی دعوت کے ذریعے برطانوی سامراج کے خلاف مسلمانان ہند کے اندر جہاد کی روح پھونکی اور ذہنی جمود کو توڑنے کے لیے اجتہاد کی اسپرٹ پیدا کی۔آزادی کی جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا۔برطانوی حکومت اور اس کے محافظوں نے مذہب کے نام پر جو منافرت پھیلا رکھی تھی اسے ختم کرنے کے لیے مولانا آزاد نے ''ترجمان القرآن'' کے ذریعے حقائق کو نمایاں انداز میں پیش کر کے انسانی احترام اور آزادی کی تعلیمات پیش کیں۔ رسول اکرم صلعم سے عقیدت ومحبت کا بھرپور احترام کرنا سکھایا اور ان کے اقوال کو اپنی تقریر اور خطبات میں جگہ بہ جگہ پیش کر کے دینی خدمات انجام دیں۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَالنَّاسَ عَلَيْهَا۔ لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَالنَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوالصَّلٰوةَ وَلَاتَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعاً۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔

ترجمہ:۔

تم ہر طرف سے منہ پھیر کر ''الدین'' کی طرف رخ کرو۔یہی خدا کی بناوٹ

ہے جس پر اس نے انان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی ''الدین القیم'' (یعنی سیدھا اور سچا دین) ہے۔ لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔ (دیکھو!) اسی (ایک خدا) کی طرف متوجہ رہو، اس کی نافرمانی سے بچو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے۔''[۲]

اللہ نے قرآن کریم میں سیاسی عدل اور معاشی انصاف کی جو تعلیمات پیش کیں اور رسول پاکؐ نے جن تعلیمات پر عمل کر کے اسلامی حکومت کو ایک رفاہی حکومت اور ہر قسم کی اونچ نیچ سے پاک صاف نظام حق کا نقشہ بنا کر پیش کیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس نظریہ کے پیش نظر آیات قرآنی کی تفسیر کی مدد سے اس پر مکمل روشنی ڈالی ہے اور صالح انصاف پر مبنی معاشی نظام کی حمایت کر کے اس کو عملی زندگی میں لانے کی تلقین کی۔

اسلام کی صداقت ثابت کرنے کے لیے انہوں نے بے شمار مضامین لکھے۔ اور الہلال سے لے کر البلاغ تک میں مسئلہ خلافت، اسلام کا نظریہ جنگ، دعوت حق، قرآن کا قانون عروج و زوال اور ''ترجمان القرآن'' اور ''تذکرہ آزاد'' وغیرہ کتابوں میں جو بھی پیغامات پیش کیے وہ سب کے سب دین الٰہی کی دعوت کی تجدید ہے اور 'الامر بالمعروف والنہی عن المنکر' کو زندہ کرنا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

''مسلمانوں کا سرمایہ زندگی کا یہی فرض ہے، وہ دنیا میں اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں کہ خیر کی طرف داعی ہوتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو جہاں کہیں دیکھتے ہیں اپنے تئیں اس کا ذمہ دار سمجھ کر روکتے ہیں۔''[۳]

قرآن کہتا ہے۔

كتاب انزلنٰه اليك لتخرج الناس من الظلمات الى النور۔

ترجمہ:۔

قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی ہے اس لیے کہ انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے۔[۴]

یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد قرآن کو محور و مرکز مانتے تھے اور اس کے علاوہ کسی اور مرکز سے حاصل کیے گئے خیال کو صریح کفر سمجھتے تھے اور ان کو افسوس تھا کہ ہندوستانی مسلمان قرآن اور اسلام کی اصلی عظمت سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ بجا فرماتے ہیں۔

''ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو، وہ اپنی توحید کی تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیاوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔''۵

مولانا آزاد نے اکثر جگہ کہا ہے کہ قرآن ایک روشنی ہے۔ روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو، خواہ سیاسی ہو۔ قرآن میں ہے۔

"قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین۔ یھدی بہ اللہ من التبع رضوانہ سبل السلام و یخرجھم من الظلمت الی النور باذنہ ولیھد یھم الی صراط مستقیم۔

ترجمہ:۔

تمہارے پاس اللہ تعالی کی طرف سے روشنی آ گئی ہے۔ ایک ایسی روشنی اور حق نما کتاب جو تمہیں روشنی کی طرف بلاتا ہے اور تاریکی سے نکالتا ہے اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔۶

ہم عصر تناظر میں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ساری مصیبتیں صرف غفلت کا نتیجہ ہیں کہ انہوں نے اس خدا کی تعلیم اور عبادت گاہ کو چھوڑ دیا اور سمجھنے لگے کہ صرف نماز پڑھ لینے اور روزہ رکھ لینے سے ہی دین کے احکامات پورے ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اس روش کو یکسر ترک کر کے ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل کے لیے خالص اسلامی نظریات و خیالات پر مبنی

پیغامات کو عام کیا۔ زبیر شاداب خان اپنے مضمون ''ابوالکلام آزاد کا تصور دین'' میں لکھتے ہیں۔

''انسانی قلوب کی حیات وممات اور قوموں کی اخلاقی زندگی اور موت کا بھی یہی حال ہے۔ مایوسیاں جب حد درجے تک پہنچ جاتی ہیں اور انسانی سعی، امید کی کوئی راہ اپنے سامنے نہیں دیکھتی تو وہ خدا جو انسانوں کی جسمانی زندگی کے لیے اپنے آسمان کو حکم دیتا ہے کہ باران رحمت کا دروازہ کھول دے۔ ضروری ہے کہ انسان کی قلبی زندگی کے لیے بھی اپنے ملائکہ رحمت کو بھیج دے تا کہ پیغام امید سے مردہ دلوں میں زندگی کی حرکت پیدا کر دیں۔ مولانا آزاد نے اپنے مذہبی خیالات سیاسی، سماجی، اصلاحی غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک بے مثل نگینے کی مانند جڑ دیے ہیں۔ القسطاس المستقیم، الجہاد فی الاسلام، معجزہ وخوارق، لاتلقوا بایدیکم الیٰ الھلکم، کشف معانی سے قرآن کا مدعا کیا ہے؟، مسجد اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ، فاتحہ البلاغ اور اسی قسم کے ان گنت مضامین دین اسلام بالخصوص قرآن کے زرین خیالات سے مزین ہیں جن میں ماضی کی روداد بھی ہے۔ حال کا پس منظر بھی اور مستقبل کا مناسب انتخاب بھی۔ ہر چند کہ مولانا نے اپنے تمام خیالات کا اظہار قرآن واحادیث کی روشنی میں، دین کی حدود میں رہ کر کیا ہے لیکن ان میں زندگی کا ہر شعبہ، ہر مسئلہ، ہر عمل، ہر علم گویا کہ دنیا کی تمام فکریں جدید تر پیرائے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔'' [۷]

مولانا آزاد کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب غیر ملکی سامراج کا بول بالا تھا اور قومی تفریق کا جذبہ پھل پھول رہا تھا۔ مغرب سے مرعوبیت باطل کے غلبے کو جلا بخش رہی تھی۔ جب حق وصداقت کا اصلی تصور، اہل مذاہب کے درمیان ناپید ہو رہا تھا اور طرح طرح کے غلط نظریات لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ ایسے ہی وقت میں مولانا آزاد نے اسلامی توحید کا پیغام ایک بار پھر افراد ملت، اہل ملک اور پوری انسانیت کو دیا۔ ''ترجمان القرآن'' بیسویں صدی میں اسلام کی ترجمانی ہے اور اسلام کو اس کی اصلیت کے مطابق، کسی فرقے کے رسمی دھرم کے بجائے ایک عام نظریہ زندگی اور بہترین نظام حیات کے طور پر پیش کرنے کا اہم فریضہ ہے۔

قرآن حکیم سے مولانا آزاد کا شغف بے حد بڑھا ہوا ہے۔اپنی زندگی اور سرگرمی کے ہر دور اور ہر گوشے میں انہوں نے بنیادی ہدایت ہمیشہ کتاب اللہ سے ہی حاصل کی اور اسی کی روشنی میں اپنے تمام خیالات پیش کیے اور عملی اقدامات اٹھاتے رہے جن کا تقاضا ان کے شعور، فرض اور وقت نے ان سے کیا۔ان کا نصب العین یہ تھا کہ دین اسلام میں اجتہاد کر کے ملت اسلامیہ کی تجدید اور انسانیت کی نشاۃ ثانیہ کا سامان فراہم کیا جائے۔اس مقصد عظیم کے لیے شروع سے آخر تک قرآن ہی مولانا آزاد کے تمام افکار و اعمال کا منبع و محور اور معیار و مرکز رہا۔وہ زندگی کا ایک خاص نظریہ رکھتے تھے اور ایک نظام حیات پر ان کا ایمان تھا۔یہ نظریہ و نظام سراسر قرآن سے ماخوذ ہے۔اسی لیے قرآن کو شریعت اسلامی کی بنیاد مان کر عصر حاضر میں اسلام کا احیا چاہتے رہے تا کہ انحرافات و بدعات کے وہ سارے پروپیگنڈہ نیست و نابود ہو جائیں جو زمانے کی ستم ظریفی کی وجہ سے عوام الناس کے دلوں میں گھر کر رکھا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ باطل کا سینہ چاک ہو اور آفتاب کی طرح ایک بار پھر حق اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو جائے تا کہ اسلام کی صداقت آج کی دنیا کے سامنے نئے سرے سے آشکارا ہو۔دین مبین، جدید تمدن و تہذیب کے مسائل کو آج اسی طرح حل کر کے دکھائے جس طرح اس نے قدیم تمدن و تہذیب کے مسائل کو چودہ سو سال قبل حل کر کے دکھائے تھے۔

مولانا آزاد نے اصلاح معاشرہ اور آزادی ملک کے لیے جو تحریک چلائی، ملت کی تجدید اور انسانیت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جو جدوجہد کی اس کا سارا نقشہ انہوں نے قرآن کی ہدایت سے ترتیب دیا اور قرآنی بصیرت کی روشنی میں ہی انہوں نے اپنے کردار کی بھی تشکیل و تعمیر کی۔کیونکہ قرآن کی تعلیم ہر دور اور ہر حال میں تمام انسانوں کے لیے رشد و ہدایت ہے۔مولانا آزاد کے نزدیک اسلام نیشنلزم اور وطنیت باہم لازم و ملزوم ہیں۔اسلام اپنے وطن کی آزادی کے لیے قربانی دینے کو منع نہیں کرتا بلکہ اپنے وطن سے محبت کرنے کو اسلامی فریضہ مانتا ہے۔انہوں نے بار بار دہرایا کہ:

> ''مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں۔ ہندوستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے۔انہوں نے ہمیشہ نصیحت کی کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دیں۔''[۸]

ہندوستانی سیاست میں مولانا آزاد کی بنیادی قدریں مذہبی تھیں۔وہ بنیادی اخلاقی اور

انسانی قدروں کو اہمیت دیتے تھے اس لیے ان میں ایک عجیب ہم آہنگی تھی۔ وہ سیاست میں مذہب کی مداخلت کو برا تصور کرتے تھے۔ آزاد کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنی کوئی علاحدہ قومیت نہیں رکھتے۔ بلکہ ان کے پاس تو صرف ان کا مذہب ہے، خدا ہے اور یہی وہ تصورات ہیں جو مسلمانوں کو متحد اور آمادہ عمل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا آزاد کے تعزیتی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مولانا آزاد نے سب سے بڑی خدمت یہ کی ہے کہ انہوں نے ہر مذہب کے لوگوں کو بتایا ہے کہ مذہب کے دو پہلو ہیں۔

''ایک نفاق پیدا کرتا ہے۔ لوگوں کو الگ الگ کرتا ہے، نفرت کے بیج بوتا ہے۔ یہ مذہب کا جھوٹا اور جعلی پہلو ہے۔ مذہب کی حقیقی اور اصلی روح لوگوں کو متحد کرتی ہے۔ مذہب کی روح خدمت پہ مائل کرتی ہے۔ دوسروں کے لیے قربانی دینے کا درس دیتی ہے۔ وحدت کو ماننے کی ہدایت کرتی ہے۔ افہام و تفہیم پیدا کرتی ہے۔ خدمت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ یہ سبق ان تمام جماعتوں اور افراد کو سیکھنا چاہئے جو چھوٹے چھوٹے گروہ بناتے ہیں۔ زبان کی بنیاد پر، صوبے کی بنیاد پر، ذات کی بنیاد پر، نسل کی بنیاد پر مذہبی تعصّبات کی بنا پر گروہ بندی کر کے زندگی کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی وفاداریوں کے ذریعے اجارہ داریاں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان وفاداریوں کو بڑی وفادی کے تابع کر دیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں، کوئی سکھ نہ رہے یا مسلمان، ہندو یا پارسی نہ رہے لیکن ہر ایک کو ملک، قوم اور انسانیت کا خادم بننا چاہئے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے۔ سچا ہندو ہے۔ سچا عیسائی ہے۔ سچا بدھ ہے۔ سچا پارسی ہے اور سچا سکھ ہے۔ ہمیں مذہب کی اس سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کرنا چاہیے۔''[9]

مولانا آزاد اپنے عہد میں حالات حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق مذہب اسلام کو نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اور اپنے زمانے کی سیاست، ثقافت اور روزمرہ کو قرآن حکیم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھنے کی دانشمندانہ جستجو کی۔ رسول پاکؐ کے سیاسی اور سماجی تجربوں کو پیش نظر

رکھ کر جمہوریت اور متحدہ قومیت کے جدید میلانات کو اسلام کے سیاسی اصول سے مربوط کرنے بھرپور سعی کی۔ان ساری کاوشوں میں ان کے عقل، منطق، اجتہاد فکر اور جرأت عمل کو بڑا عمل دخل رہا۔انہوں نے کہا کہ مسلمان کی حیثیت سے یہ ان کی ذمہ داری اور فرض ہے کہ وہ غیر ملکی ظلم وزیادتی اور استبداد کے خلاف، اپنے وطن کی آزادی اور اسلامی اداروں کی حفاظت کے لیے نعرہ حق بلند کریں۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔قول فیصل، آزاد

۲۔ترجمان القرآن، آزاد

۳۔مضامین ابوالکلام آزاد، مرتبہ عقیل احمد جعفری، صفحہ ۱۱۶

۴۔قرآن کریم، سورہ ابراہیم

۵۔الہلال، ۸ستمبر ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۲

۶۔قرآن کریم، سورہ مائدہ

۷۔زبیر شاداب خان، ابوالکلام آزاد کا تصور دین''۔ص ۱۸۵

۸۔ڈاکٹر کامل قریشی، ہمارے زمانے میں ابوالکلام آزاد کی معنویت۔ص ۴

۹۔مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے، خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی۔

روفیدہ الاسلمیہ عصر جدید کی مسلم خواتین کے لیے ایک رول ماڈل

ڈاکٹر علی محمد بٹ
اسلامک ریسرچ اکیڈیمی
براک پورہ اننت ناگ، جموں وکشمیر

ملخص

عصر حاضر میں جو موضوع سب سے زیادہ زیر بحث ہے وہ عورت کا مسلم سماج میں کردار اور اس کے حقوق کی پاسداری ہے اس بارے میں سب سے بڑا مسئلہ عورت کی تعلیم کا ہے یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ اسلام عورت کے حقوق سلب کرتا ہے اور اس کو چار دیواری میں بند کر کے غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کو اسلام کے ابتدائی دور کی مثال بنا کر کہ نہ وہ پڑھ سکتی تھی اور نہ وہ اس بارے میں بات کر سکتی تھی کچھ مستشرقین نے اس کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ اسلام میں عورت کا کام بچے پیدا کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں حالانکہ یہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ اس الزام کو رد کرنے کے لیے اس مضمون میں دور نبوت کی ایک ممتاز خاتون کا انتخاب کیا گیا ہے جس نے میڈکل سائنس میں اپنا لوہا منوایا اس عظیم خاتون کا نام روفیدہ الاسلمیہ ہے۔ روفیدہ الاسلمیہ کو عالم اسلام میں نرس اور سرجن بننے والی پہلی خاتون کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس خاتون نے مدنی زندگی کے ہر نشیب وفراز کا باہمت انداز طور پر مقابلہ کیا اور مدینہ کے خواتین کی طبی تربیت کر کے ان کو اس دور کے بہترین معالج کی حیثیت سے تیار کیا ہے وہ ایک عظیم معالج کے طور پر جانی جاتی تھی اس کے علاوہ اس کو اتنی زیادہ طبی مہارت حاصل تھی کہ بہت جلد ایک تجربہ کار معالج کے طور پر مشہور ہوئی۔

اسلام کا مزاج انسانی مساوت پر مبنی ہے اور اس کی تعلیمات میں انسانوں کے ساتھ کسی

قسم کا بید باو نہیں برتا جاتا تھا اور نہ ہے اس میں انسان کی صلاحیت کو مدنظر رکھے کر اس کے کردار اور منصب کی قدر کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآنی تعلیمات اور سُنت رسول ﷺ میں انسان کی محنت اور تقویٰ کو اہمیت دی گئی یہ دوصفت چاہئے مرد کو حاصل ہو یا عورت کو اس میں کسی قسم کی رواداری نہیں برتی جاتی ہے۔ اسلام نے ہمیشہ ہی خواتین کو عزت دی ہے اور اسے شادی کے بعد اپنے کنبہ کا نام رکھنے، حج کرنے، وراثت میں حصہ لینے، ملازمت کرنے اور اپنا کاروبار چلانے کی اجازت دی ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں خواتین کی زندگی کے تمام شعبوں میں بہت بڑا حصہ تھا اور انہوں نے مختلف شعبوں جیسے کاروبار، تعلیم، حدیث بیان، خیراتی، نرسنگ اور معاشرتی کاموں میں اپنا حصہ ڈالا۔ خواتین ہمیشہ سے نہ صرف اپنے کنبوں میں بلکہ اپنے معاشروں میں بھی اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ اسلام نے خواتین کو حقوق اور مراعات دیئے ہیں، جو اسلام سے پہلے دوسرے مذہبی یا آئینی نظاموں کے تحت کبھی نہیں ملتے تھے۔ جزیرہ نما عرب کے مدینہ منورہ میں 620ء میں پیدا ہونے والی، روفیدہ الاسلمیہ کو عالم اسلام میں نرس اور سرجن بننے والی پہلی خاتون کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس خاتون نے مدنی زندگی کیہر نشیب وفراز کا باہمت انداز طور پر مقابلہ کیا اور مدینہ کے خواتین کی طبی تربیت کر کے ان کو اس دور کے بہترین معالج کی حیثیت سے تیار کیا ہے۔ والد کے زیرنگرانی جو خود بھی ایک عظیم معالج کے طور پر جانے جاتے تھے سے طبی مہارت حاصل کی اور بہت جلد ایک تجربہ کار معالج کے طور پر نام کمایا۔ طبی سہولیات کا ہونا، لڑائیوں کے دوران ناگزیر ہوتا تھا۔ درحقیقت، اس کی صلاحیتوں کو اتنا قیمتی سمجھا گیا تھا کہ اسے جنگ میں لڑنے والے فوجیوں کو علاج کرنے کی بنیادوں پر عظیم معالجہ کے لقب سینوازا گیا تھا۔ جنگی اوقات کے دوران، خواتین کو طبیب کا کردار ادا کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کے نتیجے میں، وہ متعدد ممتاز مسلم خواتین کی تربیت کرنے میں کامیاب ہوگئیں، جن میں حضرت محمد کی بیویاں بھی شامل ہیں۔

روفیدہ الاسلمیہ کو اسلام کے ابتدائی دنوں میں طبی اور سماجی حلقوں میں اپنے کام کے لیے پہچانا جاتا تھا، اور وہ پہلی مسلمان نرس تھی جو مدینہ منورہ میں اسلام قبول کرنے والے پہلے لوگوں میں شامل تھیں۔ اس نے دیگر انصار خواتین کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچنے پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لیے تعاون کیا۔ روفائدہ الاسلمیہ بہت سی خواتین، ہمدرد نرسوں اور ایک اچھے

آرگنائزر کے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت کے طور پر مانی جاتی ہے۔ اپنی طبی مہارتوں کے ساتھ، اس نے دیگر خواتین کو نرسیں بننے اور صحت عامہ کی دیکھ بھال کے شعبے میں کام کرنے کی تربیت دی۔ اس نے معاشرتی کارکن کی حیثیت سے بھی کام کیا، بیماری سے وابستہ معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں مدد کی۔ اپنے آپ کو نرسنگ اور دوسری طبی کاموں میں مصروف رکھنے اور بیمار لوگوں کی دیکھ بھال کرنے سے، روفیدہ ایک ماہر طبیب بن گ ء۔ وہ بہت سے لڑائیوں کے دوران اپنے خیمے میں فیلڈ ہسپتالوں میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتی تھی۔ اگر چہ انفرادی طور پر سرجری جیسے مردوں کے ذریعہ انجام دینے والی ذمہ داریاں نہیں دی گئیں، لیکن اس نے بہت ساری لڑائیوں کے دوران اپنے خیمے میں فیلڈ ہسپتالوں میں اپنی صلاحیتوں کا مردوں سے اچھے کارنامے انجام دیے اور اپنی صلاحیتوں کا بھر پور استعمال کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے تھے کہ ان کے خیمے میں زخمیوں کو بچھوتا کہ وہ اپنی طبی مہارت سے ان کا علاج کر سکیں۔ انہوں نے لڑائیوں کے دوران زخمی فوجیوں کی دیکھ بھال کی میں مردوں سے زیادہ بہتر کام انجام دی۔ روفیدہ نے تپتے ہوئے سخت صحرا کی ہوا اور گرمی سے بھی پناہ گاہ فراہم کی۔ جب خندق کی لڑائی میں سعد ابن معاث زخمی ہوئے تو، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ انہیں الاسلمیہ کے خیمے میں رکھا جائے تا کہ اس کا بہتر علاج ہو سکے۔ روفیدہ الاسلمیہ نے اپنی طبی مہارت اور طبی تجربے کو اس انداز سے منظّم کیا کہ اس نے پہلا موبائل یونٹ تیار کر کے ان کو بستیوں میں لے جا کر معاشرے کی طبی ضروریات کو پورا کرنے میں دل و جان سے کوشش کی۔ پہلے ان کا زیادہ تر، کام بنیادی طور پر حفظان صحت اور مریضوں کو مستحکم کرنے تھا لیکن اس نے طبی سہولیات کو زیادہ سے زیادہ سے مربوط اور منظّم کیا تھا۔ بحیثیت ایک محقق وہ عام لوگوں میں بیماری اور اس کے اسباب سے دلچسپی لیتی تھی۔ اس کی حیثیت سے انھوں نے غریب عوام میں حفظان صحت کی حوصلہ افزائی کرنے اور معاشرتی پریشانیوں کے خاتمے کی کوشش کی ہے تا کہ ان صحت طبی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے خراب نہ ہو سکے۔ روفیدہ نے نرسوں کی حیثیت سے خواتین ساتھیوں کے ایک گروپ کی تربیت کی تھی۔ حضرت محمد کی قیادت میں تمام جنگوں اور لڑاؤں میں، روفیدہ نے رضا کار نرسوں کے گروہوں کی قیادت کی جو میدان جنگ میں زخمیوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ اس نے بدر، احد، خندق، خیبر اور دیگر کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ جب مسلمان فوج خیبر کی جنگ میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی، روفیدہ

الاسلمیہ اور رضا کار نرسوں کا ایک گروپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور اس سے زخمیوں کے علاج کے لیے فوج کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی تا کہ وہ کسی بھی طرح کی طبی مدد بہم پہنچائیں گے جوان کے بس میں ہے کر سکیں۔ حضرت محمد نے انہیں اپنے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ نرس رضا کاروں نے اتنا عمدہ کام انجام دیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے غنیمتوں کا ایک حصہ روفیدہ الاسلمیہ کو تفویض کیا۔ اس کا حصہ ان فوجیوں کے برابر تھا جنہوں نے دراصل لڑا تھا۔ یہ اس کے میڈیکل اور نرسنگ کام کے اعتراف میں بطور فدیہ پیش کیا گیا تھا۔

امن کے اوقات میں، روفیدہ نے ضرورتمند مسلمانوں کو طبی امداد فراہم کر کے انسانی ہمدردی کی کوششوں میں اپنی شمولیت جاری رکھی۔ اس نے ضرورتمند بچوں کی مدد کی اور یتیموں، معذوروں اور غریبوں کی دیکھ بھال کی۔ بیمار اور مرنے والوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اور اس کے شہر کے لوگوں کو صحت کی تعلیم مہیا کرنے میں ان کی زندگی گزارنے پر ان کی تعریف کی گئی۔ وہ صبر، مہربان، عقیدت منداور پرعزم ہونے کی حیثیت سے بیان کی گئی ہے۔ تاریخ کے مطابق اس کے کام کے بارے میں کہانیاں کئی نسلوں میں پیش کی گئیں، تاہم، انہیں مسلم دنیا میں نرسنگ کے بانی کی حیثیت سے دوبارہ دریافت کیا گیا ہے، اور ان کے بارے میں کئی علمی مضامین لکھے گئے تھے۔ ایک مضمون میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا، "روفیدہ الاسلمیہ نے نرسنگ کی ترقی اور بہتری کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ بہتر نرسنگ کی بنیاد کے طور پر نئے قواعد و روایات وضع کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ پاکستان میں، نرسنگ اور دایہ خانہ کے مشہور کالج، آغا خان یونیورسٹی میں ایک عمارت ان کے نام پر رکھی گئی ہے۔ بحرین یونیورسٹی میں نرسنگ میں سالانہ روفیدہ الاسلمیہ انعام دیا جاتا ہے۔ ہر سال یونیورسٹی آف بحرین میں آئرلینڈ میں رائل کالج آف سرجنز (آر سی ایس آئی) ایک طالب علم کو نرسنگ میں روفیدہ الاسلمیہ انعام سے نوازتا ہے۔ یہ ایوارڈ یافتہ، سینئر کلینی کل میڈیکل اسٹاف ممبروں کے پینل کے ذریعہ طے کیا جاتا ہے، وہ ایک طالب علم ہے جو مریضوں کو نرسنگ کی عمدہ نگہداشت کی فراہمی میں مستقل مزاجی کرتا ہے۔ روفیدہ الاسلمیہ نے فلورنس نائٹنگل سے 2001 سال پہلے مسلمان دنیا میں نرسنگ متعارف کروائی تھی جو جدید نرسنگ کے بانی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام نے مسلم خواتین کو اپنی صلاحیت استعمال کرنے کی بھرپور اجازت دی ہے عصر حاضر میں مسلم خواتین کو قید و بند کر کے مسلم سماج کے ایک آدھے حصہ کو مفلوج کیا جاتا ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلم سماج روز بہ روز زوال پذیری کی طرف گامزن ہے مزید برآں یہ کہ مسلم خواتین کو بھی اسلامی تعلیمات کا لحاظ کر کے اپنی عفت اور عزت کو داغ دار کرنے سے گریز کرنا لازمی ہے اس قدامت پسندی کو سیاست مہرے کے طور پر اسلام کے مخالف استعمال کیا جاتا ہے دور جدید میں ورکنگ عورت پھر اپنا مقام بحیثیت ماں، بہن اور بیوی بھول کر من مانی پر اتر آتی ہے جو معاشرہ کیلیے مددگار ثابت ہونے کے بجائے ایک ناسور کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتا ہے اس لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سماج میں جس کا منصب جو بھی ہو گھریلوں زندگی میں اس کا عمل دخل نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اسلام نے کسی کو نہیں روکا اپنی صلاحیت استعمال کرنے سے بشرط یہ کہ وہ وہ معاشرہ کو بگاڑنے کے بدلے معاسرہ کو صحیح نہج پر کھڑا ہونے میں مددگار ثابت ہو سکے اور انصاف قائم ہو سکے۔

☆☆☆

ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط

راشد قادری
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، (یو۔پی)

Abstract:

The concept of writing literary histories is not so much old. Around three hundred years back the early history were written which were based on the principles given by the writer himself,but when there were a large number of literary histories came into the existence, the people started engaging themselves with this field of study and built up some objective principles and different methodologies to write a comprehensive history.

The article "**Adbi Tareekh Nawesi ke Asool o Zawabit**" this article presents some principles and theories of Urdu literary historiography.

☆☆☆

دانشور طبقے میں اکثر یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ کیا اردو میں ادبی تاریخ نویسی کی کوئی صالح اور واضح روایت موجود ہے؟ اور کیا کچھ اصول وضوابط دیکھنے کو ملتے ہیں؟ ادبی تاریخ نویسی سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئیں ڈاکٹر سید عامر سہیل اور نسیم عباس احمر اپنی مرتب کردہ کتاب

''ادبی تاریخ نویسی'' میں لکھتے ہیں۔''اردو میں تاریخ نویسی کے اصولوں اور تقاضوں کو بہت کم موضوع بنایا گیا ہے''۔[1] اردو میں جو ادبی تاریخیں لکھی گئیں ہیں ان کے مورخین، مولفین اور مصنفین نے اپنے دیباچے یا مقدمے لکھے ہیں ان میں ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں کا ذکر غیر مربوط اور سرسری انداز لیے ہوئے ملتا ہے۔ اس مضمون میں ان چند مشترکہ اصولوں کو ایک جگہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنہیں مختلف مورخین اور ماہرین نے ادبی تاریخ نویسی میں استعمال کیا اور ان اصولوں کو ادبی تاریخ نویسی کے لیے ضروری گردانہ۔ اس کے علاوہ اس میں بعض ان اصولوں کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہیں جن سے واقف ہونا ایک ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے۔

اردو ادب کی ابتدائی تاریخوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان میں نہ تو ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں کی وضاحت ملتی ہے اور نہ ہی وہ جدید تصورات و معیارات کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ ان میں صرف ابتدائی دور کے مختلف ادوار کی لسانی خصوصیات کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد لکھی جانے والی تاریخوں میں تحقیقی پہلو کے علاوہ تخلیقات کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادب اور کلچر کے باہمی ردعمل پر بھی زور دیا گیا ہے۔ ان ادبی تاریخوں میں زیادہ تر توجہ شاعروں اور ادیبوں کی سوانحی حالات اور محاسن کلام پر صرف کی گئی ہے۔ دراصل اردو ادب کی ابتدائی شکل تذکروں میں ملتی ہے لیکن ان تذکروں میں موجود مواد کی صرف شعراء کے کلام اور ان کے مختصر سوانحی کوائف سے زیادہ اہمیت نہیں۔ ادبی تاریخ کے سلسلے میں پہلی کتاب محمد حسین آزاد کی '' آب حیات'' ہے اس کے اندرونی سرورق پر لکھا ہے: '' آب حیات'' (مشاہیر شعرائے اردو کے سوانح عمری) '' آب حیات''، محض شاعروں کی تاریخ ہے۔ کتاب کے دیباچے میں خود محمد حسین آزاد نے یہ واضح کیا کہ شعرا کے ''جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں۔ انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو۔''[2]

اس کے بعد رام بابو سکسینہ کی کتاب '' تاریخ ادب اردو'' اعجاز حسین کی ''مختصر تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر محمد صادق کی ''A History Of Urdu Literature'' ڈاکٹر انور سدید کی ''اردو ادب کی مختصر تاریخ وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو نصابی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئیں ان

میں تاریخ نویسی کے اصولوں کی وضاحت نہیں ملتی۔ادبی تاریخ نویسی کے موضوع پر ایک دو کتابیں ہی دیکھنے کو ملتی ہیں ایک سعد مسعود غنی کے ایم فل کے مقالے کا ایک حصہ بعنوان ''ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اردو'' (ایک تحقیقی جائزہ) اور دوسری سلمان احمد کی مرتب کی ہوئی ''اردو کی ادبی تاریخیں: نظری مباحث'' اس کے علاوہ اور بھی دو تین پی ایچ ڈی کے مقالے ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط سے متعلق دیکھنے کو ملتے ہیں۔ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں اردو کے مشہور ادبی تاریخوں کا تجزیہ پیش کیا اور ساتھ ہی ساتھ ان میں ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے مختلف ادیبوں کے نظریات شامل کیے ہیں۔لیکن انہوں نے بھی اس بات کا کوئی مکمل ذکر نہیں کیا کہ ادبی تاریخ لکھنے کا فلسفہ کیا ہے،اس کے واضح نکات کیا ہیں،اور اس کی سائنسی تشکیل کس طرح کی جانی چاہیے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' ایک بڑا کارنامہ ہے جس کا شمار اردو ادب کی اہم اور مستند تاریخوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے تاریخ کے تخلیقی امتزاج سے کلچر،فکر اور ادب کو ایک وحدت اور اکائی بنانے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو ادب کی تاریخ کے متوازن اور جدید تصور کو پیش کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے پیش لفظ میں یہ واضح کیا کہ انہوں نے ''تاریخ ادب اردو'' کی ترتیب میں کن اصولوں کو سامنے رکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر ''ادب'' زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی '' تاریخ '' کو بھی ایسا آئینہ ہونا چاہئے جس میں ساری زندگی کی روح کا عکس نظر آئے۔میں نے ''تاریخ ادب اردو'' کو ایسا ہی آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے۔بنیادی طور پر تخلیقی امتزاج سے میں نے تاریخ ادب کو ایک وحدت،ایک اکائی بنانے کی کوشش کی ہے۔یہاں ادبی تاریخ کی سطح پر تحقیق،تنقید اور کلچر مل کر ایک ہو گئے ہیں۔''[۳]
>
> ''میں نے ان تمام مواحث کو بھی تاریخ کے دامن میں سمیٹنے اور صاف کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مختلف زاویوں سے صاحبان علم وادب اظہار خیال کر چکے ہیں۔تاریخ ادب اردو میں میں نے کم وبیش ہر بات کو حوالے اور سند کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہاں آپ کو تنقید کی صورتیں بھی ملیں گی۔تحقیقی ومعروضی بھی اور

نفسیاتی وسماجی بھی۔تہذیبی ونظریاتی بھی اورعمل وتجزیاتی بھی۔تشریحی ولسانیاتی بھی اوراخلاقی و جمالیتی بھی اوراس کی وجہ یہ ہے کہ ہرتخلیقی وتاریخی شخصیت کا مطالعہ ایک ہی معیاراورایک ہی پیمانے سے نہیں کرنا چاہیے۔تخلیقی رنگارنگی اور روایت کے تنوع کے پیش نظر،کا لطیف فرق واضح ہو سکے۔میں نے تنقیدی رائے دیتے وقت بے جا تعمیم، بے بنیاد کلیوں اور ہر مصنف کے لیے یکساں الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے۔'' ۴

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تاریخ نویسی کے جدید تصورات اور معیارات کو تاریخ نویسی کا حصہ قرار دیا انہوں نے تاریخ کے قدیم تصور کو رد کرتے ہوئے تاریخ کی تشکیل کے جدید تصور پیش کرنے کی بات کی انہوں نے تاریخ میں شعبہ جاتی مطالعات کو رد کرتے ہوئے بین الشعبہ جاتی مطالعات (Intera Disciplanry studies) کی طرف توجہ دلائی۔وہ فرانسیسی انلس دبستان،کو تاریخ نویسی کا منفرد اور جدت پسند دبستان تسلیم کرتے ہیں اس لیے وہ اس دبستان سے استفادہ کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں لکھتے ہیں:

''انلس دبستان نے یہ زور دار آواز بلند کی تھی کہ تاریخ میں اب شعبہ جاتی مطالعات (Compartment Studies) کا دور گزر گیا ہے،یعنی سماجی تاریخ اب سماجی تاریخ کا نام نہیں ہے یعنی کسی خاص عہد کی سماجی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دوسرے متعلقہ علوم وفنون سے بھی مدد لیں گے،لہذا جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ ہم اس دور کے سماجی علوم،اقتصادیات، دیومالا سیاسی تاریخ،تہذیبی وثقافتی عوامل،فلسفہ وغیرہ کی روشنی میں اس دور کا تجزیہ مکمل کریں گے۔'' ۵

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مطابق ادبی تاریخ نویسی کے لیے مورخ کی رائے ہر صورت معتدل،متوازن مگر حقائق پر مبنی ہونی چاہیے۔ادبی مورخ کے اندر تاریخی شعور،تنقیدی بصیرت، ادبی تحقیق،تخلیقی صلاحیت ،ماضی شناسی ،متحرک شخصیت ،بے مثل تخیل او ر ذہنی بصیرت جیسی خصوصیات ایک ادبی مورخ کے اندر ہونا لازمی گردانتے ہیں۔ادبی تاریخ نویسی کے ان اصولوں کی

روشنی میں انہوں نے تاریخ نویسی کے کام کو انجام دیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ادبی تاریخ نویسی سے متعلق اصول وضوابط کے کچھ اہم نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔تخلیقی شخصیات کا حوالہ

۲۔تخلیقات کے حوالے اور ان پر تنقید وتبصرہ

۳۔مختلف تخلیقی تجربات کی قدر و قیمت طے کرنا

۴۔ادب میں رجحانات، میلانات اور مختلف تحریکوں کا تجزیہ اور ان کا محاکمہ

۵۔تمام ادبی صورت حال اور تخلیقی شخصیات کے مطالعے کے لیے سیاسی، سماجی، اخلاقی، اقتصادی امور کو پیش نظر رکھنا۔

اس کے علاوہ ظفر الحسن لاری نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''ادبی تاریخ کے اصول'' تحریر کیا یہ رسالہ ''ہندوستانی'' میں اپریل ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا اس پورے مضمون میں ادبی تاریخ نویسی کا کوئی خاص زاویہ دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' کے پہلے باب ''ادبی تاریخ نگاری'' میں رابرٹ اسپلر کا مضمون ''ادبی تاریخ'' کے اہم نکات پیش کیے ہیں جو درجہ ذیل ہیں: ادبی مورخ کو ایسے سوالوں کے جواب دینا چاہیے کہ ادبی تخلیق کیسے، کب، کہاں اور کیوں وجود میں آئی اور اس کا دوسری تخلیقات، نیز انسان کی سماجی تاریخ سے کیا رشتہ ہے۔

ادبی مورخ کو دوسرے علوم میں بھی کچھ نظر رکھنی چاہیے مثلاً فلسفہ، نفسیات، مذہبی یا سیاسی تاریخ، ڈراما، لسانیات، ذرائع ابلاغ وغیرہ۔ اسے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن انہیں اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دینا چاہیے۔ وہ خیال رکھے کہ وہ پہلے ادبی مورخ ہے بعد کو کچھ اور۔ ادب کی تخلیق میں جو عوامل اثر انداز ہوتے ہیں، ادبی مورخ کو اپنی تاریخ نویسی میں ان پر توجہ کرنی چاہیے، وہ یہ ہیں:

۱۔افکار وتصورات مثلاً مذہبی عقائد وافکار، سوشلزم، وجودیت، مارکسیت، فرائڈ کی جنسی نفسیات وغیرہ۔

۲۔کلچر

۳۔سیاسی اور سماجی ادارے مثلاً سیاسی پارٹی، کلیسا، کلب، اسکول، کالج اور یونیورسٹی، سیمینار، مباحثے، سمپوزیم وغیرہ۔

۴۔روایت اور اساطیر۔ یہ عناصر علم بشریات (Anthropology) کی دین ہے۔

۵۔سوانح عمری، یہ ادبی تاریخ کا اہم ترین مآخذ ہے۔

اسپلر کے مطابق ادبی مورخ کا کام تاریخی تنقید کرنا ہے جو ادبی تنقید سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ ان عوامل کی نشاندہی کرتا ہے جن کے زیر اثر تخلیق وجود میں آئی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ماہرین علم و ادب نے اپنے اپنے نظریات اور اصولوں کی روشنی میں تاریخ نویسی کے کام کو انجام دیا۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں اور نہ ہی ادبی تاریخوں پر اظہار خیال کا یہ موقع ہے۔ بلکہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو ادبی تاریخ نویسی کے لیے مورخین ضروری سمجھتے ہیں اور جن کا ادبی تاریخ نگاری میں فقدان نظر آتا ہے۔ ادبی تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے جو کہ مورخ کی تاریخی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ادبی تاریخ نویسی میں تنقید کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادبی تاریخ نویسی میں تنقید کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب کے مورخ کے لیے ضرورت ہے کہ اس میں بیک وقت تاریخی شعور بھی ہو اور قوت تجزیہ بھی۔ نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بھی ہو اور گہری تنقیدی نظر بھی۔''[۲]

تنقید کو تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اگر تنقید تاریخ کی دست گیری نہ کرے تو تاریخ میں محض واقعات کا انبار لگ جائے۔ اہم اور غیر اہم کا فرق تنقید کے بغیر ممکن نہیں جب ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ادبی تاریخ نویسی میں ہم کن کن شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کریں گے تبھی ہم اپنے اندر موجود ادبی نقاد سے مدد لیتے ہیں۔ تاریخ اور تنقید دونوں کو لازم و ملزوم نہیں قرار دیا جا سکتا البتہ تنقید کے مختلف نظریات نے ادبی تاریخ نویسی کو متاثر ضرور کیا ہے۔ زیادہ تر مورخین کا ماننا ہے کہ تحقیق و تنقید دونوں تاریخ کے لیے ضروری ہیں تاریخ نویسی کے لیے مصنف کا محقق ہونے ساتھ ساتھ اسے ایک اچھا نقاد بھی ہونا چاہیے اسی نکتہ کے پیش نظر ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> ''ایک اچھی تاریخ ادب وہ شخص نہیں لکھ سکتا جو صرف محقق ہو اور نہ ہی تاریخ

ادب کی تصنیف کسی ایسے فرد کا کام ہے، جو صرف نقاد ہو اچھی تاریخ ادب صرف وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو بیک وقت تحقیق وتنقید پر قدرت رکھتا ہو۔'' ۷

تحقیق وتنقید کے بغیر ادبی تاریخ نویسی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ایک متوازن تاریخ نویسی کے لیے ضروری ہے کہ مورخ تحقیق وتنقید پر یکساں قدرت رکھتا ہو اگر مورخ کا کام تحقیقی اعتبار سے کمزور ہے تو وہ صحیح نتائج اخذ نہیں کر سکتا اور اگر تنقیدی اعتبار سے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے تو تاریخ کی تفہیم اور اس کا حسن غیر معیاری ہوگا۔ لہٰذا ادبی تاریخ کے لیے ان دونوں کا امتزاج اور توازن ضروری ہے۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

''بے لاگ اور بے باک تنقید کرنا نہ صرف تصنیف پر، بلکہ ذات مصنف پر بھی (مصنف کی حیثیت سے)، اب تک ''پل صراط'' پر گزرنے سے کم نہیں ہے۔ لیکن میں نے اس کی جسارت کی ہے۔ میں نے تصنیفوں اور مصنفوں پر اعتراضات کیے ہیں، دوسروں کے اعتراضات نقل کر کے حسب موقع ان کی تائید یا تردید کی ہے۔ میری تنقیدیں شاید تلخ و بیباک نظر آئیں، لیکن بے لاگ اور بے لوث بھی ثابت ہوں گی۔ میں نے صحیح تعریف اور جائز حمایت بھی ایسی کی ہے کہ کسی دوسرے مورخ و تذکرہ نویس نے نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ سب ایک تاریخ و تذکرے کے ضروری اجزاء تھے، بغیر اس روشنی کے، کسی تصنیف و مصنف کے مطالعہ کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔'' ۸

ادبی تاریخ، ادبی مورخ سے گہری تنقیدی بصیرت کا تقاضہ کرتی ہے کیونکہ تنقیدی شعور کی غیر موجودگی میں ادبی تاریخ واقعات کا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے۔ ادبی مورخ کے لیے جہاں ایک اچھا محقق اور تنقید نگار ہونا ضروری ہے وہیں اس میں تاریخی شعور اور ذہنی بلوغت بھی موجود ہونی چاہیے۔ کیونکہ ادبی مورخ کے سامنے موجود مواد کم وبیش ایک جیسا ہی ہوتا ہے لیکن ہر مورخ کی شخصیت کا عکس اس کی تحریر میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ای۔ ایچ۔ کار (E.H.Car) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخی حقائق و واقعات وغیرہ مورخ کے پاس اسی طرح موجود ہوتے ہیں

جیسے مچھلی فروش کے تختے پر مچھلی۔۔۔ ادبی مورخ تاریخ کے تختہ سے مطلوبہ حقائق فراہم کرتا ہے، گھر لے کر ان کی طباخی کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تیار کر کے پیش کر دیتا ہے۔'' ۹

اس کے علاوہ ادبی تاریخ نویسی کے ضمن میں ادوار کے تعین اور اصناف ادب کی تقسیم کے حوالے سے مختلف نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ادوار کی تقسیم سے حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ کئی طرح کے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے تاریخ کی یہ ادوار بندی تاریخی تصور کو ایک مجموعی صورت میں پیش کرنے سے قاصر رہتی ہے اس لیے کہ ادوار بندی ایک خاص تصور اور نظریے کے تحت ہی پروان چڑھتی ہے۔ ادبی تاریخ میں ادوار کی تقسیم سے متعلق مختلف طرح کے سوالات سامنے آتے ہیں مثلاً ادوار کی تقسیم کیسے کی جائے، کن بنیادوں پر کی جائے اور متون کی نفسیاتی تشکیل میں کس طرح کے اثرات کارفرما تھے یہ ایسے سوالات ہیں جو نظریاتی حوالے سے مختلف ہو سکتے ہیں مگر کیا ادوار کی تقسیم کے بغیر ادبی تاریخ لکھی جا سکتی ہے؟۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''دوسرا سوال اردو کی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کا ہے۔ پرانے تذکرہ نویسوں نے ادب کو قدیم، متوسط اور متاخرین کے خانوں میں بانٹ دیا۔ مگر جلد ہی اس تقسیم نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا ذکر ہونے لگا اور جب بیسویں صدی میں دکنیات کا ادبی ذخیرہ دریافت ہوا تو اردو ادب کو ایک دبستان مل گیا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد اور خاص طور پر مغربی اثرات عام ہونے کے بعد تاریخ ادب کا ایک باب لکھا جانے لگا، عہد جدید۔ لیکن ان ادوار کی تقسیم کی وضاحت اور اس تقسیم کا جواز اور اس جواز کی وضاحت ضروری ہے۔'' ۱۰

ادوار بندی تاریخ نویسی کے تصور اور قوت متخیلہ کو محدود کرتی ہے جس سے قاری کے ذہن میں ایک مکمل تصویر نہیں بن پاتی کیونکہ ادوار بندی ایک مخصوص تصور اور نظریے کے تحت ہی تشکیل پاتی ہے لیکن ان تمام کے باوجود ادبی تاریخ نویسی میں ادوار بندی کا ایک عمومی رجحان ہے۔ ڈاکٹر تنویر انجم کے مطابق:

"The study of continuity and change in specific spatio-temporal contexts is what constitutes history. The phenomenon of change serves as a basis for periodization of history, whereby past is periodized, or divided into various eras/ epochs/ periods, or units of time .the purpose of periodization of past is to render history and time intelligible." 11

لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ادبی مورخین کی ایک جماعت ادوار بندی سے پیدا ہونے والے تفہیمی مسائل اور ذہنی رویوں کے پیش نظر اس عمل کو بہتر نہیں مانتے ان کے مطابق:

''ادب کو دور عہد میں تقسیم کرنا نہ صرف فنی گناہ ہے بلکہ تاریخی نقطہ نظر سے بھی صحیح نہیں ہے۔۔۔عہد اور زمانے کی تقسیم ہر حیثیت سے گمراہ کن ہے اور ادب کی نسبت غلط تاثرات پیدا کرتی ہے۔'' ۱۲

جب ہم کسی معاشرے کی تاریخ کے ادوار کی تشکیل اور ان کے درمیان فرق یا ان کی انفرادیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقتاً انسانی شعور کی تاریخ ایک منزل سے اگلی منزل کی طرف بڑھنے کے نتیجے میں مختلف طرح کی بنیادی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جن کی ظاہری صورتوں میں مادی سطح پر کلچر اور غیر مادی سطح پر فکری تبدیلی رونما ہوتی ہے جو انسان، کائنات اور معاشرے کے مابین رشتوں کو ایک نئی اساس فراہم کرتی ہے۔ادبی مورخ ادوار کی تقسیم ایسی ہی کسی بڑی سماجی تبدیلی کی وجہ سے کرتا ہے جس سے چیزوں کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ادوار بندی کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''میں نے ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ، روایت کی تشکیل و تعمیر اور ردعمل و تبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے۔تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور

روح ادب بیک وقت سامنے آجائیں۔جدید ادبی تاریخ کے ادوار کی تقسیم اسی طرح ہونی چاہیے۔'' ۱۳؎

ادبی تاریخ میں ادوار کے تعین کا عمل کسی خاص مرحلے پر بدلتے ہوئے تناظر یا تاریخ کی تفہیم و تجزیہ کے لیے کیا جاتا ہے۔تاریخ نویسی کے عمل میں تغیرات،حوادث اور تبدیلیوں کا تعین اور ان کی تعریف ان معیارات،نظریات اور تصور کی پابند ہوتی ہے جس کے تحت تاریخ کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس لیے تاریخ کے مطالعے،تفہیم اور تدریس کے لیے ادوار بندی اضافی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

جب ہم کسی قوم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے پس منظر میں اس کے قومی خصائص موجود ہوتے ہیں۔تاریخ نویسی کے دوران مختلف سماجی اداروں،سیاسی تحریکوں،معاشرتی رسم ورواج،مذہبی افکار اور ثقافتی تنظیموں اور بدلتی ہوئی جمالیاتی،ادبی اور علمی قدروں کو پیش نظر رکھ کر ان کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے لہٰذا ادبی مورخین کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سماجی،معاشی،سیاسی،اقتصادی اور فنی ماحول میں پیش کریں۔عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخ'' کے پیش لفظ میں اپنا خیال پیش کرتے ہیں:

''آئندہ ادبی تاریخ لکھنے والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سیاسی، معاشی،سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کریں۔'' ۱۴؎

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اسی نظریہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''ادب کی تاریخ میں اپنے عہد کے ثقافتی و تہذیبی آثار و احوال کے ساتھ پورے ادب یعنی نثر و نظم دونوں کی جملہ اصناف اور ان کے اسالیب کو زیر بحث لانا ضروری ہے۔'' ۱۵؎

ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی اس نکتہ کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں ان کے مطابق:

''ادبی تاریخ جتنی زیادہ تہذیبی،ثقافتی،سماجی اور فکری تاریخ کے نزدیک ہوگی وہ اسی قدر زیادہ تاریخ کے نزدیک ہوگی،وہ اسی قدر زیادہ وقیع،بصیرت افروز اور زیادہ مفاہیم و مطالب رکھتی ہوگی''۔ ۱۶؎

ادبی تاریخ کو بامعنی بنانے میں سب سے اہم کردار واقعات کے بیان میں تسلسل اور

ربط کا ہے جس کے ذریعہ تاریخ کی ایک کڑی دوسری کڑی سے جڑی رہتی ہے اور ایک مکمل نقشہ ہمارے ذہنوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے واقعات کو سمجھنا آسان اور عام فہم ہو جاتا ہے لیکن جب ہم اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو تنظیم اور تسلسل دور دور تک نظر نہیں آتا مثلاً حضرت بابا فرید گنج شکر کے بعد حضرت امیر خسرو اور پھر آپ کے عہد سے لے کر قطب شاہی یا بہمنی دور تک لمبے لمبے وقفے دیکھنے کو ملتے ہیں اگر چہ اب اس پر کام ہونے لگا ہے۔ادبی تاریخ نویسی میں تسلسل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''تاریخ کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ واقعات وحقائق کا محض اندراج کر دے بلکہ ضروری ہے کہ مختلف سروں کو باہمی ربط دے کر ایک ایسی تنظیم میں لے آئے کہ یہ تصویر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہو جائے اور ادب کا حقیقی، تاریخی ارتقا بھی نظروں کے سامنے آجائے۔''۱۷

ادبی تاریخ نویسی میں تسلسل سے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے یہ ہے:

''مورخ تاریخ پیدائش، سن وفات اور زندگی کے اہم واقعات کے سن فراہم کرتا ہے گویا سب سے پہلے وہ سوانحی مواد حاصل کرتا ہے پھر اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد ادبی تاریخ کی روایت، تسلسل، رجحانات، نظریات اور ہر عہد کے ادبی ارتقاء پر غور وفکر کر کے مصنفین کے کام کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے''۔۱۸

ادبی تاریخ نویسی میں تحریروں کے نمونوں کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔نمونوں کو شامل کرنے سے ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ قاری ان نمونوں کی مدد سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لے گا کہ مورخ کے خیالات ورجحانات کیا تھے۔کیا وہ واقعی اس لائق ہے کہ اسے ادبی مورخ کہا جائے اس کے ساتھ ساتھ مورخ کے مزاج اور اس کی تنقیدی رویہ سے بھی واقفیت ہو جائے گی۔دوسرا یہ فائدہ ہوگا کہ مورخ کے نمونے دینے کے لیے مصنف کی کم وبیش تمام نگارشات کا مطالعہ کرنا ہوگا تا کہ وہ ان میں سے کسی منتخب تحریر کو نمونے کے طور پر پیش کر سکے۔اس سلسلے میں حامد حسن قادری اپنی کتاب ''داستان تاریخ اردو'' میں اپنا نظریہ اس طرح پیش کیا ہے:

''میں نے ''داستان تاریخ اردو'' میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے، تاریخ و

ارتقائے اردو کے ساتھ ہر دور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کیے ہیں، اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔''۱۹

ادبی تاریخ نویسی میں مآخذ کی اہمیت مسلم ہے اور انہیں کی بنیاد پر تحقیقی اور تنقیدی شعور سے کام لیا جاتا ہے۔ایک مورخ جب ادب کی تاریخ میں جو کچھ بیان کرتا ہے اس کے لیے وہ مآخذ پیش کرتا ہے اپنے حوالوں کے ذریعہ وہ اپنی کہی ہوئی بات کو مستند اور حقیقی بناتا ہے۔ادبی تاریخ نویسی میں تمام حقائق ،حوالے اور سند کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے ثانوی مآخذات کے بجائے بنیادی مآخذات کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے داخلی و خارجی شواہد اور تنقیدی اصولوں سے کام لینا پڑتا ہے۔داخلی تنقید اور شواہد کے ذریعہ منشائے مصنف کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور ہم یہ طے کر پاتے ہیں کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب اور معنی کیا ہیں، بنیادی مآخذ اور سند کی غیر موجودگی میں ثانوی مآخذات میں سے جو عمدہ اور بہتر کا انتخاب ہو اس سے مدد لینا چاہیے ڈاکٹر جمیل جالبی ثانوی مآخذ سے متعلق لکھتے ہیں:

''جن مصنفوں کی تصانیف غیر مطبوعہ تھیں ان کے اقتباسات ،اپنے نقطۂ نظر یا تنقیدی وضاحت کے لیے ،اس لیے زیادہ دیے ہیں کہ یہ مخطوطات قاری کی دسترس سے باہر ہیں۔'' ۲۰

حوالے کا قابل قبول ہونا ادبی تاریخ نویسی کے لیے ضروری ہے مرزا سلیم بیگ کے مطابق:

''ادبی تاریخ کے سلسلے میں مآخذ کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مورخین اس سلسلے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے ہیں وہ بنیادی مآخذ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''۲۱

ادبی تاریخ نویسی کے سلسلے میں مآخذ کے ساتھ ساتھ اسلوب کی بھی اپنی اہمیت ہے ادبی تاریخ کا اسلوب بیان کس طرح کا ہونا چاہیے اس بارے میں محققین اور مورخین کے مختلف نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں۔بعض ناقدین کا نظریہ ہے کہ ادبی تاریخ کا اسلوب سیاسی تاریخ جیسا ہو جبکہ بعض ناقدین اور مورخین کے نزدیک اسلوب سادہ اور واضح ہو۔مورخ کے لیے ضروری ہے کہ ایسا اسلوب

اختیار کرے جس میں شگفتگی ہو، رنگین اور شاعرانہ اسلوب سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی جائے تا کہ اسلوب کی رنگینی، اصل تاریخ کی خوبصورتی کو پھیکا نہ کردے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''ایسا اسلوب جو آئینے کی طرح صاف وشفاف ہو، رواں وشگفتہ ہو اور عام بول چال کی زبان سے قریب ہوتے ہوئے بھی ''ادبی'' ہو۔'' ۲۲

پروفیسر اختر وقار عظیم لکھتے ہیں:

''تاریخ نویسی کا فن مورخ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ وہ غیر ضروری باتوں اور فروعات میں پڑ کر اپنے مرکز خیال کو چھوڑ دے۔ نہ اسے زبان و بیان کے بکھیڑوں میں پڑنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ پہیلیاں بجھوانے کی۔ بلکہ اس کا فرض محض یہ ہوتا ہے کہ سیدھی سادھی زبان میں ہر واقعے کو بلا کم و کاست اس کی اصل شکل میں بیان کردے۔'' ۲۳

مورخ کو نہایت احتیاط اور تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لا کر ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو تحقیقی اصولوں کے خلاف نہ ہو واضح اور دلچسپ ہو جس سے قاری کو اجنبیت کا احساس نہ ہو بلکہ قاری اور مصنف کے درمیان ایک ربط بنا رہے۔ مورخ کو مشکل الفاظ سے بچنا چاہیے اور اسے آسان الفاظ میں اپنی باتوں کو پیش کرنے کا ہنر آتا ہو۔ پیرایہ ہی ان تاثرات اور خیالات کا آئینہ ہے جو فنکار کے ذہن میں ہے، اس لیے اسے بہت خوبصورت اور واضح ہونا چاہیے۔ ادبی تاریخ نویسی میں قوت متخیلہ کی افادیت کو کئی جدید مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ مثلاً ایڈورڈ ٹامپسن، کارلو گنز برگ، لادوری وغیرہ ان کے مطابق ''تاریخ نویسی میں تخیل کی مدد سے تاریخ کی فکری پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے اور کس طرح دستاویزات سے کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں۔'' ۲۴ ادبی تاریخ نویسی میں قوت متخیلہ کی افادیت اور اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ ادب میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی وضاحت اور تشریح بغیر قوت متخیلہ کے انجام کو نہیں پہنچ سکتی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ماضی کی بازیافت کے لیے ادبی مورخ کا متخیلہ نہایت تیز ہونا چاہیے۔ اس کا متخیلہ بے جان ماضی میں روح ڈال دیتا ہے ساکن زمانوں کو متحرک کر دیتا ہے اور سوئی ہوئی مجلسوں میں روح ڈال دیتا ہے۔'' ۲۵

ادبی تاریخ نویسی میں شاعروں اور ادیبوں کے معیارات کا تعین اور ان کی درجہ بندی کس طریقہ سے کی جائے یہ بھی ایک اہم مسلہ ہے۔ گم نام ادباء اور شعراء کو کس طرح سے اور کس پیمانے پر ادبی تاریخ نویسی کے مرکز سے جوڑنے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا اس مسئلہ سے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ادبی تاریخ صرف ان شخصیات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہے جو ماضی میں رجحان سازی، عہد سازی اور اثر اندازی کے اعتبار سے قابل ذکر مقام رکھتی ہوں۔

ادبی تاریخ نویسی میں کلچر کے ساتھ ساتھ افکار کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ افکار سیاسی، مذہبی ،سماجی، تاریخی، فلسفیانہ اور ادبی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ادبی تاریخ نویسی میں تحریکات ور جحانات پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کلچر، سیاسیات اور تخلیقات کے بیان میں احتیاط ضروری ہے۔ کلچر کے بیان میں صرف انہیں واقعات کا بیان کرنا چاہیے جن سے ادبی تاریخ متاثر ہوئی ہو اس کے علاوہ تہذیبی وثقافتی پس منظر اور ادب کے بیان میں وحدت ہونی ضروری ہے۔ مورخ کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ تحریکات کا بیان کرے تو اپنے ذکر میں انہیں تحریکات کو شامل کرے جو قابل قدر ہوں، جن سے کئی ادیب وابستہ رہیں ہوں یا جن میں مشترکہ خصوصیات پائیں جاتی ہوں۔ جیسے علی گڑھ تحریک، ادب لطیف، انجمن پنجاب، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، جدیدیت وغیرہ۔

ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات اور عصری صورت حال پر بھی نظر رکھے اور ان عصری صورت حالات سے مراد ادب کو ان کڑیوں سے جوڑنا ہے جو حالات کے وطن سے پیدا ہو کر ادب کو متاثر کرتی ہیں اور ان نظریات ادب کو بھی متاثر کرتی ہیں جنہوں نے ادب میں کوئی اہم رول ادا کیا ہو۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''تاریخ ادب میں جہاں کسی دور کے اپنے معیار اور نظام اقدار کی مدد سے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہاں ساتھ ساتھ دائمی ادبی معیاروں سے بھی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تاریخ ادب پڑھتے ہوئے یہ بات بھی محسوس ہونی چاہیے کہ جہاں مخصوص واقعات ور جحانات شخصیتوں کو جنم دے رہیں، وہاں ادبی شخصیتیں بھی واقعات ور جحانات کو جنم دے کر تاریخی دھارے کو نئی جہت دے رہی ہیں۔''[۲۶]

مذکورہ بالا تمام مواحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مختلف مورخین نے انفرادی طور پر

ادبی تاریخ نویسی میں جن اصولوں کو پیش نظر رکھا اگر ان اصولوں کی روشنی میں تاریخ نویسی کی جائے تو ایک عمدہ تاریخ وجود میں آسکتی ہے۔ایک ادبی مورخ کے اندر وہ تمام بنیادی شعور اور رویہ موجود ہونا چاہیے جو تاریخ نویسی کے لیے ضروری ہے۔ایک معیاری ادبی تاریخ نویسی کے لیے مندرجہ ذیل اصولوں کو اپنایا جاسکتا ہے۔

ا۔ادبی مورخین کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر تاریخ نویسی کے بنیادی لوازمات سے واقفیت اور ان کے ذہنوں میں عام تاریخ اور ادبی تاریخ کا فرق مکمل طور پر واضح ہونا چاہیے انہیں تاریخ کے نظریات،تصورات اوران کی اقسام کا بھی علم ہونا چاہیے،اس کے ساتھ ساتھ مختلف مفکرین اور ماہرین علم تاریخ کے نظریات سے بھی واقفیت بے حد ضروری ہے مثلاً ابن خلدون، بیچو، کانٹ، ہرڈر، ہیگل، ٹائن بی، رسل اور ول ڈیورانٹ وغیرہ اس کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ،جدید یورپ کی تاریخ،عالم اسلام کی تاریخ وغیرہ کا بھی مطالعہ ہونا چاہیے۔

۲۔ایک ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب کے ارتقا کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہو اور تمام پہلوؤں کا مجموعی طور پر احاطہ کر سکے۔

۳۔ایک معیاری ادبی تاریخ نویسی کے لیے مورخ کو کئی علوم جیسے نفسیات،سماجیات،معاشیات وغیرہ کا علم،دیگر تواریخ جو اس تاریخ کے ساتھ ساتھ چل رہی ہوتی ہیں ان کا گہرا مطالعہ اور زبان پر مضبوط پکڑ ہونا بہت ضروری ہے۔

۴۔ادبی تاریخ نویسی میں واقعات کو منطقی ربط میں بیان کرنے کے لیے فلسفہ اور منطق کا علم،تہذیب اور ثقافت کا بنیادی فرق،شخصی تجزیے کے لیے نفسیات سے واقفیت ایک ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے۔

۵۔ادبی تاریخ نویسی کے لیے مورخ کا کام جہاں مواد اکھٹا کرنا ہے وہاں اس کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے ان تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔اول واقعات کو روایت کرنا دوم ان واقعات کو تفصیل سے لکھنا سوم ان کا تجزیہ کرنا۔

۶۔ادبی تاریخ کو بامعنی بنانے میں سب سے اہم کردار واقعات کے بیان میں تسلسل اور ربط کا ہے جس کے ذریعہ تاریخ کی ایک کڑی دوسری کڑی سے جڑی رہتی ہے۔

۷۔ادبی مورخ جب کسی شاعر یا ادیب کی سوانحی حالات کو ترتیب دے رہا ہو تو اس شاعر یا ادیب کے عہد

کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ اور نفسیاتی افکار واقدار پر بھی نظر رکھے۔

۸۔تاریخ نویسی کے ضمن میں جہاں تک ہو سکے اولین اور بنیادی مآخذ سے رجوع کرنا چاہیے۔غیر معتبر مآخذ سے کام نہ لے اور ایسے حوالوں پر استناد واستدلال کی بنیاد نہ رکھے جو کمزور اور مشکوک ہوں۔

۹۔ادوار کی تقسیم میں مورخ کو اس دور کی اہم ادبی روشوں کو مدنظر رکھ کر کرنا چاہیے۔

۱۰۔ادبی تاریخ نگاری میں ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو غیر جانبدارانہ اور براہ راست حقائق کو پیش کرنے والا ہو۔

۱۱۔ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ ادب میں کم وبیش ہر بات کو حوالے اور سند کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرے۔

۱۲۔ادبی تاریخ نگاری میں غیر جانبداری سے حالات وواقعات کو بیان کرنا چاہیے۔اس کے ساتھ ساتھ غیر جانبدار رائے دینا تحریر کا انتخاب، نتائج اخذ کرنا سوانحی قصیدہ نگاری سے بچنا، تصنیف اور مصنف دونوں پر ضرورت کے وقت بے لاگ اور بے باک تبصرہ، تعصب سے اجتناب ضروری ہے۔

۱۳۔ادبی تاریخ نگاری میں جہاں شعرا اور نثر نگاروں کو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے وہاں ادبی تحریکیں بھی اہمیت کی حامل ہیں اس سلسلے میں یہ بات زیر غور رہنی چاہیے کہ ان تمام تحریکوں کا تذکرہ کیا جائے جنھوں نے ادب میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

۱۴۔مورخ کو مواد کی تلاش میں ایمانداری اور محنت سے کام لینا چاہیے تاکہ اغلاط کم ہوں اور بے جا طوالت کسی ادیب کے حوالے سے وہ بھی ادبی تاریخ کے لیے ناقص ہے۔

۱۵۔ادبی تاریخ نگاری میں صحیح سنین دینے پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

۱۶۔ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ماضی شناس ہو ادبی مورخ جس قدر ماضی شناس ہوگا اسی قدر اس کے تاریخ کے اوراق روشن نظر آئیں گے۔

۱۷۔ادبی مورخ کو اپنے کام میں ایک متوازن رویہ اختیار کرنا چاہیے۔اس رویہ کو اپنا کر وہ اپنے کام میں حسن انتخاب کا رستہ اختیار کرتا ہے، اور حسن انتخاب سے اس کے ہاں حسن نظر پیدا ہوتا ہے۔یہ حسن نظر ہی ہے جو ادبی تاریخ جیسے خشک شے کو مطالعہ کے لائق بناتا ہے۔

۱۸۔ادبی تاریخ نگاری میں ادب کے ادوار کی خصوصیات کو بیان کرنے کا تصور اب پرانا ہو چکا ہے

ادبی تاریخ کو سیاسی اور تہذیبی تاریخ کے مختلف دھاروں کے بہاؤ میں رکھ کر بھی دیکھنا چاہیے۔

مندرجہ بالا اصلوں کو پیش نظر رکھ کر ادبی تاریخ نویسی کے کام کو بہتر طریقہ سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ اصول بھی حرف آخر نہیں ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ چیزیں بدلیں گی روایات تبدیل ہوں گے سہولتیں حاصل ہوگی تو ان میں بھی تبدیلی ہوگی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تاریخ جیسے اہم موضوع کے لیے آج تک ایسے کوئی اصول مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جن کی روشنی میں ادبی تاریخ کو سائنٹفک انداز میں مرتب کیا جا سکے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ادبی تاریخ کے اصول وضوابط تحقیقی کی روشنی میں مرتب کیے جائیں جس سے نہ صرف ادبی تاریخ کا معیار بلند ہوگا بلکہ تاریخ کے طالب علموں اور تاریخ نویسی سے متعلق کام کرنے والوں میں ادبی تاریخ کے حوالے سے ایک نئی آگاہی کو فروغ ملے گا اور وہ ادبی تاریخ کو محض شاعروں اور ادیبوں کی ترتیب وار سوانحی حالات یا دبستان ہائے دہلی یا لکھنؤ سے بڑھ کر جاننے کی کوشش کریں گے ساتھ ہی ساتھ ان کے اندر یہ صلاحیت بھی پیدا ہو جائے گی کہ وہ ادبی تاریخ کو کس طرح سے عالمی تاریخ کے حصے کے طور پر پیش کریں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر (مرتبین) ادبی تاریخ نویسی، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور۔۲۰۱۰ء، ص ۷

۲۔مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات، کتابی دنیا، دہلی۔۲۰۲۰ء، ص ۱۴

۳۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۹، ص ۷

۴۔ایضاً، ص ۹

۵۔بحوالہ منزہ منور سلہری، اردو کے ادبی تاریخ کے اصول وضوابط، مشمولہ نور تحقیق (شمارہ نمبر ۲۰) شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، ص ۳۴

۶۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، (جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۹، ص ۸

۷۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ تخلیق ادب، نیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۶ء، ص ۱۶

۸۔حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، لکشمی نراین اگروال تاجر کتب، آگرہ (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۵۷ء، ص پیش لفظ

۹۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔۲۰۰۳ء، ص ۱۳

۱۰۔ڈاکٹر محمد حسن، ادبی تاریخ نویسی، مرتبین (ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر) مشمولہ مضمون، تاریخ ادب کی تدریس، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور۔۲۰۱۰ء، ص۱۵۳

11.Tanvir Anjum, Temporal Divides: A Critical Review of Majour Periodization Schemes in Indian History, Journal of Social Sciences, GCU, Faisalabad,Vol.1,No.1,July 2004,Page No.32.

۱۲۔سلمان احمد، اردو کی ادبی تاریخیں: نظری مباحث، قصر الادب، حیدر آباد۔۱۹۹۹ء، ص۳۷

۱۳۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، (جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۹، ص۹

۱۴۔عبدالقادر سروری، اردو کی ادبی تاریخ، حیدر آباد۔۱۹۵۸، ص۶۔۵

۱۵۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی ادبی تاریخ کا بنیادی مواد اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مشمولہ: ماہ نامہ قومی زبان، کراچی۔اگست۲۰۰۲ء، ص۲۴

۱۶۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ادبی تاریخ کے تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ تخلیق ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔جنوری۲۰۰۸ء، ص۱۱

۱۷۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۹، ص۸

۱۸۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ادبی تاریخ کے تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ: ادبی تاریخ نویسی، مرتبین: ڈاکٹر سید عامر سہیل، اور نسیم عباس احمر، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور۔۲۰۱۰ء، ص۶۲

۱۹۔حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، لکشمی نراین اگروال تاجر کتب، آگرہ دوسرا ایڈیشن۔۱۹۵۷ء

۲۰۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۹، ص۸۔۷

۲۱۔مرزا سلیم بیگ، تحقیق، شعبہ جاتی تحقیقی مجلّہ، شمارہ نمبر۳، شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔اکتوبر۱۹۸۹ء، ص۱۷۲

۲۲۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۹، ص۸۔۷

۲۳۔پروفیسر اختر وقار عظیم، شبلی بحیثیت مورخ، ابلاغ پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ص۲۲

۲۴۔جم شارپ، نیچے سے ابھرتی تاریخ، ڈاکٹر مبارک علی، مترجم۔مجلّہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور۔۱۹۹۹ء، ص۲۰

۲۵۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔۲۰۰۳ء، ص۱۱

۲۶۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۱۹، ص۸

جموں وکشمیر اور اردو افسانے کے شارحین

ڈاکٹر فیاض احمد ڈار

اوڑی بارہمولہ

ریاست جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی تاریخ، تہذیب، رہن سہن، آپسی بھائی چارہ، غربت، بے روزگاری، شادی بیاہ کے مسائل اور دوسرے بیسوں چیزوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان چیزوں کو افسانوں میں سمیٹنا ہی کشمیر کی ترجمانی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے افسانوں میں یہاں کے آبشاروں، زعفران زاروں، بہتے دریاؤں، خوبصورت بدلتے موسموں، لہراتے مرغزاروں، فلک بوس پہاڑوں اور صحت افزاء مقامات کی ہو بہو عکاسی ملتی ہے۔ ان میں یہاں کے لوگوں کا درد و کرب جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان میں جہاں دلکش مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں ان میں مفلوک الحال اور ستم زدہ لوگوں کی داستانوں کی کمی بھی نہیں ہیں۔ افسانہ نگاروں نے کشمیر کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی و تہذیبی حالات کی بخوبی ترجمانی کی ہے۔ یہاں کا بھائی چارہ، ہندو مسلم اتحاد، مہمان نوازی، انسان دوستی اور حب الوطنی کے موضوعات اردو افسانے میں کثرت سے ملتے ہیں۔ چنانچہ جموں وکشمیر میں مشترکہ تہذیب پائی جاتی ہے۔ یہاں ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ لوگ طرح طرح کی زبانیں بولتے ہیں اور ایک دوسرے کے کلچر میں بھی تفاوت پائی جاتی ہے۔ افسانہ نگاروں نے یہاں کی مشترکہ تہذیب کے کئی پہلوؤں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جن افسانہ نگاروں نے اپنی تحریر کو ریاست جموں وکشمیر کی ترجمانی کے لیے مخصوص رکھا ہے، ان شارحین میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، کرشن چندر، پروفیسر حامدی کشمیری اور پروفیسر عبدالرشید خان وغیرہ شامل ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی۔

پریم ناتھ پردیسی 1909 میں فتح کدل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت کشمیر میں

ہوئی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1947ء تک محکمہ کسٹمز سے وابستہ رہے۔ بالآخر ۹ جنوری 1955 کو انتقال کر گئے۔ پردیسی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شعروشاعری سے کیا۔ لیکن جہاں اردو افسانے میں ریاست جموں و کشمیر کی ترجمانی کا سوال ہے تو اس کا آغاز پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں سے ہوا۔ درحقیقت ریاست جموں و کشمیر میں افسانہ نگاری کی باضابطہ ابتدا بھی پردیسی کے افسانوں سے ہوئی ہے۔ بقولِ عبدالقدر سروری۔

> ''افسانہ نگاری کا آغاز یہاں بھی، اس میں شک نہیں کہ روایتی، روحانی اور کسی حدتک رسمی انداز سے ہوا، لیکن جوں ہی ان ادیبوں کا شعور بیدار ہوا اور فن پر دسترس کا ایقان پیدا ہو گیا۔ ان کی اپنی ذاتی صلاحتیں ابھرنے لگیں اور اپنی سر زمین کی حقیقی زندگی کے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور بعض وقت سیاسی پس منظر والے افسانے سرانجام دیئے جانے لگے۔ جس سے جموں اور کشمیر کے افسانوں میں مقامی رنگ اور انفرادیت نمایاں ہونے لگی۔ افسانہ نگاری میں سب سے عظیم نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ پنڈت پریم ناتھ پردیسی ہے''۔(۱)

اگر چہ ان سے قبل کئی افسانہ نگاروں نے افسانے تخلیق کیے، لیکن پردیسی کی تخلیقات کی انفرادیت، معنویت اور اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ ان کے افسانے تقسیم ملک سے قبل اور تقسیم ملک کے بعد بھی مشہور و معروف رسائل و جرائد جیسے لاہور کے ہمایوں اور ادب لطیف میں شائع ہوئے اور سراہے بھی گئے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ''سچی پرارتھنا'' نام کی ایک کہانی سے کیا جو جموں کے روزنامہ رنبیر'' میں 1932ء کو شائع ہوئی ان کے تین افسانوی مجموعے اور ''دنیا ہماری 1940'' ''شام وسحر 1941'' ''بہتے چراغ 1955'' شائع ہوئے۔

پردیسی کے افسانوں میں کشمیر کے ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں یہاں کے لوگوں کے مسائل اور ان کی زندگی کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں ایک طرف کشمیری زندگی کی تہذیب و تمدن، جبر واستحصال، بے روزگاری، غربت وافلاس، تقسیم وطن اور سر مایہ داروں کا مفلوک الحال طبقے پر استحصال کی تصویر کشی ملتی ہے۔ دوسری طرف ان میں یہاں کے رسومات، کھیت کھلیان، سر بفلک درخت جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق پروفیسر سید احتشام

''بہتے چراغ'' کے اظہار خیال میں یوں رقم طراز ہیں۔

''پردیسی کو کشمیر کی زندگی، تہذیب اور روایات سے محبت تھی اور ان ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کر کے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔یہی ایک افسانہ نگار اور انسان کی حیثیت سے ان کی بڑائی ہے۔''(۲)

پریم ناتھ پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے مختلف مسائل مثلاً ہجرت، بے روزگاری اواستحصال کو موضوع بحث بنایا ہے۔افسانہ ''دھول'' جہاں کشمیر کے ان عورتوں کی ترجمانی کرتا ہے جو اپنی تہذیب کی پابند ہوتی ہیں وہیں اس میں یہاں کے خوبصورت مناظر کی عکاسی بھی ملتی ہے۔مثلاً جھیل ڈل، بلیوارڈ کا حسین سڑک، پری محل، شنکراچارہ اور گگری بل ایسے نام ہیں جو فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔

وہ پری محل کی مہیب صورت پہاڑوں کے پیچے صبح کا مسکراتا ہوا سورج دو نیزے اوپر آچکا تھا۔اور ابھی تک اسے اپنے پپوٹوں میں آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔

اس کے قدموں کے آگے، دل کے کشادہ پاٹ سے پرے، بیلوارڈ کی حسین سڑک پر سبزی سے بھرے ہوئے چھکڑے، شہر کی طرف دوڑ رہے تھے اور سڑک کے کنارے بنے ہوئے بنگلوں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر ٹٹو والے گھوڑوں کی باگیں تھامے انتظار کر رہے تھے۔ان کے افسانون میں کشمیر کی تاریخ جلوہ گر ہے۔غرض پریم ناتھ پردیسی ریاست کے جموں وکشمیر کا ایک حساس اور ہمدرد ادیب تھے۔ وہ کشمیری عوام کے رنج وغم سمجھتے تھے جس کا احساس ان کے تینوں افسانوی مجموعوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ان کے افسانوں میں محبت، اخوت، آپسی بھائی چارے اور امن پسندی کا درس ملتا ہے۔اور ان کے کردار امن پسندی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پردیسی جموں وکشمیر کا وہ افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیوں میں کشمیر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ بلکہ اس نے کشمیر کو اپنے اصلی رنگ وروپ میں پیش کیا۔

پریم ناتھ در

پریم ناتھ در 25 جولائی 1913ء میں کشمیر کے گرمائی دارالخلافہ سرینگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سرینگر میں ہی حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور چلے گئے۔ 1977 میں

اس فانی دُنیا سے رخصت ہوئے۔ پریم ناتھ دَر پریم ناتھ پردیسی کے ہم عصر تھے۔انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز 1945 میں ایک کہانی بعنوان ''غلط فہمی'' سے کیا جو لاہور کے معروف رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی دن کے فن بھی نقط آغاز تصور کی جاتی ہے۔ مذکورہ کہانی کی فنی مہارت سے متاثر ہوکر ادبی دنیا کے مدیر اعلیٰ صلاح الدین پرویز نے کہا تھا۔

''پریم ناتھ در بہت جلد افسانوی حدود کو آگے بڑھائے گا اور فن کے پرچم ان دیکھے میدان میں گاڑے گا۔'' (۳)

ان کے افسانوں کے تین مجموعے ''کاغذ کے واسدیو'' نیلی آنکھیں 1961 چناروں کے سائے میں'' شائع ہو چکے ہیں۔ان کا شمار یہاں کے صفہ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہیں اپنے وطن سے اس قدر پیار تھا کہ بیرون ریاست میں قیام کر کے بھی کشمیریت ان کی رگ رگ میں بھی تھی۔وہ کشمیر کے چپے چپے سے آگاہی رکھتے تھے۔

پردیسی کا طرح در نے اپنے افسانوں میں بھی کشمیر کی ترجمانی کی ہے۔ان کے افسانوں میں سبحان، عزیزہ، رحمان اور رام جو ایسے کردار ہیں جو کشمیری سماج کے سوا کئی اور نہیں ملتے ہیں۔اسی طرح ان کے افسانوں کے موضوعات، ماحول، پلاٹ اور مکالمہ کشمیری ہے۔علاوہ ازیں ان کی تخلیق میں کشمیری الفاظ بکثرت ملتے ہیں، البخصوص کانگڑی اور سماوار کا ذکر اکثر ملتا ہے۔

غرض کہ پریم ناتھ دَر نے کشمیر اور کشمیریت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔حب الوطنی ، پسماندہ اور مفلوک الحال عوام سے اظہار ہمدردی ان کے افسانوں کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے قدرتی حُسن و جمال کو دیکھنے کے لیے سیاح مختلف ممالک سے آتے ہیں۔جس سے یہاں کے غریب عوام کو روزگار ملتا ہے۔اس کی عکاسی ''گیت کے چار بول'' افسانہ میں یوں ملتی ہے۔

''شہریوں کی خاطر پہاڑوں سے برف بھی جمع کرتے ہیں اور دو دو ڈھائی ڈھائی من کے بوجھ گھاس میں لپیٹے، پیٹھ پر اٹھائے شہر شرینگر میں لے آتے ہیں۔شہر کی سرحدوں پر شہری برف فروش ان کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر اس ٹوکری کو اپنی سفید پگڑی پر رکھ کر یہ برف جیسا برف فروش جھوم جھوم کر گلیوں کی طرف چل پڑتا ہے۔کشمیر کی برف تو آسمان سے آتی ہے جس میں نہ تو شیشے کی وہ کاٹتی

ہوئی چمک ہوتی ہے نہ تیزی، نہ اس میں وہ سختی ہوتی ہے کہ اسے بھی لمبی کیل اور
بٹے ہی توڑ دیں۔اس برف میں تو چاند کی نرم نرم روشنی ہوتی ہے۔''(۴)

مذکورہ افسانے کا غریب کسان اونچے پہاڑوں سے برف اپنے کندھوں پر اٹھا کر گہری سانس لیتے ہوئے شہر کے برف فروشوں کو بیچ دیتا ہے اور یہ لالچی برف فروش محنت کشوں کا میٹھی زبان میں استقبال کر کے سستے داموں میں ان سے برخریدتے ہیں۔اس کے علاوہ درمنظر کشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ نیلی آنکھیں افسانہ میں انہوں نے جھیل ڈل کی منظر کشی اس طرح کی ہے کہ اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں میں پھیر جاتی ہے۔

الغرض پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں کشمیری سماج کے مختلف مسائل اور یہاں کے مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ان کے تمام افسانوں میں فنکارانہ بصیرت نقط عروج پر نظر آتی ہے۔ان کے افسانے نہ صرف موضوع بلکہ فنکارانہ بصیرت کے اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ چڑھاوا اور گیت کے چار بول ایسے دو افسانے ہیں جو قاری پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

کرشن چندر:

کرشن چندر کی ولادت 23 نومبر 1913 کو بھرت پور اجستھان میں ہوئی۔ان کے والد کا نام گوری شنکر چوپڑا اور والدہ کا نام پرمیشوری دیوی تھا۔کرشن چندر کو اس وقت سرسبز شاداب وادی میں رہنے کا موقع ملا جب ان کے والد گوری شنکر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے کے لیے پونچھ آئے۔ چنانچہ کرشن چندر اس وقت بہت چھوٹے تھے۔اس لیے وہ کشمیر کی سیاسی اقتصادی، ثقافتی اور سماجی حالت کے ساتھ ساتھ حُسن سے مالا مال وادی کے آب و ہوا سے بھی متاثر ہوئے۔کرشن چندر نے ابتدائی تعلیم مینڈھر کے ایک اسکول میں حاسل کی۔ جب کہ انہوں نے میٹرک کا امتحان وکٹوریہ جبلی اسکول پونچھ سے پاس کیا۔تعلیم کے سلسلے میں پونچھ کے قیام کے دوران ان کو یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، طرز زندگی، سوچ وفکر اور زندگی کے مختلف مسائل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور فن پر دست گاہ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے متذکرہ مسائل کو اپنی تحریروں میں سمیٹا۔پطرس بخاری کی سفارش پر 1939ء میں انہیں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ''پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت ملی۔ان کا پہلا افسانہ ''یرقان'' ادبی دنیا لاہور

میں شائع ہوا۔ان کی پہلی شادی 1940ء کو لاہور کی ودیاتی سے جب کہ ان کی دوسری شادی 7 جولائی 1962ء کو نینی تال کی سلمٰی صدیقی سے ہوئی۔

تعلیم کے سلسلے میں پونچھ کے قیام کے دوران ان کو یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، طرز زندگی، سوچ وفکر اور اس زندگی کے مختلف مسائل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔اور فن پر دستگاہ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے متذکرہ مسائل کو اپنی تحریروں میں سمیٹا۔ان کے افسانوں میں کشمیر کے پہاڑوں، کوہساروں سبزہ زاروں، خوبصورت چشموں، دلکش باغات اور نغمہ ریز دریاؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔انہوں نے اپنی بیشتر کہانیوں میں خلوص کے ساتھ یہاں کے رہگزاروں، پیڑ پودوں اور پسماندہ طبقہ سے وابستہ لوگوں کو پیش کیا ہے۔کشمیر سے محبت کا اظہار انہوں نے ''کشمیر کو سلام'' میں کیا ہے۔

> ''یہ ہے وہ کشمیر کی دھرتی میری ماں ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ماں کے قدموں میں جنت ہوتی ہے۔بات یہ ہے کہ کشمیر جنت بے نظیر ہے مجھے اس تک معلوم نہ ہوئی جب تک کہ مجھ اس جنت سے باہر نکالا گیا۔شاید جنت انسان کے دل کے باہر نہیں بلکہ اندر ہی ہوتی ہے۔اگر ایسا ہے تب بھی مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میرے دل کے اندر جو جنت ہے وہ کشمیر ہے''۔(۵)

کرشن چندر نے اس وقت بھی کشمیر کے حالات واقعات اور ان کے مسائل کی ترجمانی کی ہے جب کشمیر مشکل حالات سے گذر رہا تھا۔ف اس کی عکاسی ''سڑک کے کنارے'' افسانے میں یوں ملتی ہے۔

> ''۔۔۔ہاں یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے جس کے بیٹوں نے ہزاروں مصیبتوں کے ہجوم کے ہوتے ہوئے بھی اپنی حسن کاری نہیں کھوئی۔اپنے گیت نہیں کھوئے، اپنی ثقافت نہیں چھوڑی، زندہ رہنے کی آرزو اور محنت کرنے کی امنگ نہیں کھوئی۔ان کے حوصلے دن بدن باعزم وپُر شباب نظر آتے ہیں''۔(۶)

اسی طرح عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں کرشن چندر کے افسانوں میں کشمیر کے حالات پیش ہونے کا سبب یوں بیان کیا۔

> ''کرشن چندر کشمیر سے ایک اور طرح بھی وابستہ ہیں۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی کشمیر سے ہوا اور ابتدائی کہانیاں اور ناول جو انہوں نے لکھے وہ کشمیر ہی کے پس

منظر میں لکھے گئے ہیں۔ تین افسانے ''ریمان''، جہلم میں ناؤ پر'' مصور کی موت اور
ناول'' شکست''، کشمیر ہی کی زندگی سے متعلق ہیں۔''(۷)

یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی کہانیوں میں کشمیر کی ترجمانی اور کشمیری عناصر جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بالخصوص ''بالکونی'' اور آلوچے'' میں کشمیریت کو ابھارا گیا ہے۔ افسانہ بالکونی، یہاں کی خوبصورت جگہ گلمرگ میں واقع فردوس ہوٹل سے متعلق ہے۔

افسانہ کا مرکزی کردار دراصل اس ماحول کو تلاش کرنا چاہتا ہے جہاں لوگ امن و آشتی اور سکون سے جئیں۔ جہاں کوئی کسی کو نہ ستائے، جہاں صرف اخوت، اتحاد اور اتفاق ہو۔ مشینی دور نے آج کے انسان سے یہ سب کچھ چھین لیا ہے اور وہ آج اس کے شور شرابے سے تنگ آ چکا ہے۔ لہٰذا وہ بالکونی کی طرح پُرسکون جگہ ڈھونڈنے میں لگا ہے۔ افسانہ نگار نے اس پُرسکون جگہ کے لیے کشمیر کے صحت افزا مقام گلمرگ کا انتخاب کیا ہے۔ جہاں بیرونِ ممالک سے آنے والے سیاحوں کو سکونِ قلب اور تسکین روح نصیب ہوتی ہے۔

کشمیر کے خوبصورت فضاؤں کے پس منظر میں دو حسین دھڑکتے ہوئے دل، '' چاند کو چھونے کی باتیں'' درد، غمنا کی فضا اور افسردگی کے ماحول میں شیاما، بگی اور گومتی حسین لڑکیاں جو کسی پردیسی کی بے وفائی کا شکار ہیں۔ ان افسانوں میں مظہر فطرت کو کرداروں کی سی حیثیت حاصل ہے جو ان کے افسانوں کو ہر حال کامیاب بنا دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی کہانی '' آلوچے'' کشمیر کی بدلتی صورت حال کی عکاسی کرتی ہے۔ مذکورہ کہانی کا مرکزی کردار جگ موہن ہے جو جنسی افعال کا بہت زیادہ شوقین ہوتا ہے اور اپنی چالاکی سے کسی بھی خوبصورت عورت کو اپنے ہوس کا شکار بناتا ہے۔ وہ کشمیر میں سیاح کی حیثیت سے داخل ہو کر یہاں کی ایک حسین عورت کو اپنے ہوس کا نشانہ بناتا ہے جو مفلوک الحال طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جگ موہن جب دوبارہ طویل مدت کے بعد جنسی بھوک مٹانے کے لیے کشمیر تشریف لاتا ہے تو یہاں کے حالات میں بڑی تبدیلی پاتا ہے ان حالات میں یہاں کی عورت اچھے اور بُرے میں تمیز کرنا جانتی ہے۔ اب وہ عزت نفس کی حفاظت کرنا جانتی ہے وہ کئی مجبوریوں کے باوجود بھی اپنی عزت کو بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے۔ جگموہن اس صورتحال میں اس پرانی

عورت کو پھر سے گناہ کرنے کی دعوت دیتا ہے تو وہ اس کو بطور تنبیہ اپنے کم سن بیٹے قادر کے ہاتھ رومال میں لپٹے ایک پھٹا پُرانا جوتا بھیجتی ہے۔

''قادر رومال کو جھلاتے ہوئے آرہا تھا۔ رومال بھرا ہوتھا۔ جگموہن کی نگاہوں میں پھول ہی پھول کھلتے گئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کشمیر کی دلہن اپنی نرگس آنکھوں سے شرما کر اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ قادر نے خیمے کے اندر آ کے بھرا ہوا رومال جگموہن کے سامنے رکھ دیا۔ جگموہن نے کانپتے ہاتھوں سے رومال کھولا۔ رومال میں کشمش نہیں تھی۔ اخروٹ بھی نہیں تھے۔ بادام بھی نہیں تھے۔ ایک پھٹا پُرانا گھسا ہوا جوتا تھا جس میں اس کا دس روپے کا نوٹ رکھا تھا۔ جگموہن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے وہ پھٹا ہوا جوتا کھینچ کر اس کے منہ پر مارا ہو''۔(۸)

کشمیر کے پس منظر میں کرشن چند کے افسانے تخلیق کرنے کا اصل مقصد یہاں کی سیاسی، سماجی حالات، اقتصادی بدحالی، جاگیرداری، رسوم و روایات کے سائے میں جنم لینے والے جرائم اور عورت کے بے بسی و بے کسی کا پردہ ہٹانا تھا۔ ان کے افسانوں میں یہاں کے خوبصورت مناظر کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ انہوں نے کشمیر کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ کشمیر کے ماضی کو سمجھنے کے لیے جہاں تاریخ و جغرافیہ پڑھنے کی ضرورت ہے وہاں کرشن کی تخلیقات بھی اس سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ کشمیر کی رعنائیوں کی منظر کشی جس انداز سے کرشن چندر نے کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

''منظر کشی میں کرشن چندر کا مقابلہ اردو کا کوئی نثر نگار نہیں کر سکتا۔ کسی ادیب یا شاعر نے کشمیر کے پہاڑوں، وادیوں، چشموں، ندیون، جھیلوں، مرغزاروں، قصبوں، دیہاتوں کی ایسی اچھی تصویریں نہ کھینچی ہوں گی۔ مناظر قدرت کرشن چندر کی نگاہ کو وسعت اور معیار عطا کرتے ہیں۔''(۹)

پروفیسر عبدالرشید خان

پروفیسر عبدالرشید خان پیشے سے محکمہ اعلیٰ تعلیم میں بحیثیت پروفیسر (اردو) کام کرتے ہیں۔ وہ تنقید اور تحقیق کے علاوہ افسانہ نگاری مین بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں ملک کے موقر جرائد اور روزناموں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کو مشہور اردو روزنامہ ''ہند سماچار'' میں اشاعت کی

جگہ مل گئی ہے۔ پروفیسر خان کی اکثر کہانیوں کا موضوع قومی یکجہتی اور حب الوطنی رہا ہے۔ ان کا یقین ہے کہ جب تک ملک کے عوام یکجہتی اور حب الوطنی کی قدر و قیمت کی اہمیت اور افادیت نہیں سمجھیں گے، تب تک ملک کے طول وارض میں امن وامان قائم نہیں ہوسکتا ہے۔ ان کے مطابق تمام انسانوں کو ایک اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ تفرق بازای یا امتیاز برتنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ پروفیسر خان نے بھی دیگر قلم کاروں کی طرح کشمیر کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور تہذیبی معاملات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ انسان، انسان کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کرے نہ کہ ایک حیوان کی طرح۔ وہ اپنی کہانیوں میں مختلف مذاہب کے پیروکارون کے ساتھ دوستی رکھنے اور اپنے والدین اور بزرگوں کا احترام کرنے پر سخت زور دیتے ہیں۔ ''حویلی کے اندر''، ''حویلی کے باہر''، ''سرکٹی لاش''، ''نگہبان''، ''نیلوفر''، ''آوارہ''، ''روح''، ''مردے کا تحفہ''، ''فحاشہ''، ''ادھوری کہانی'' اور ''گلاب جامن'' وغیرہ ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ جو جالندھر سے شائع ہونے والے اردو اخبار ''ہند سماچار'' میں شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر خان نے افسانوی ادب پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں ''اردو افسانے میں جنسی نفسیات'' اور ''ادب اور جنس'' بہت مشہور ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔ حامد کشمیری نمبر، محمد اشرف ٹاک، جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز، شمارہ 4-7 ص 559

۲۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بہتے چراغ۔ اظہار عقیدت، احتشام حُسین بروکار پریس سرینگر کشمیر 1955 ص 4

۳۔ جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے، مرتب سلیم سالک میزان پبلیشر زبٹہ مالو سرینگر 2011 ص.33

۴۔ ایضاً ص۔25

۵۔ پریم ناتھ در۔ چناروں کے سائے میں فنکار کلچرل آرگنائزیشن سری نگر، کشمیر 1991 ص 85۔

۶۔ 'میرے دل کی جنت کشمیر ہے' کرشن چندر شیرازہ جموں کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یج کرشن چندر نمبر ص 156

۷۔ ایضاً

۸۔ کشمیر میں اردو، دوسرا حصہ پروفیسر عبدالقادر سروری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویج سرینگر

۹۔ کرشن چندر اور ان کے افسانے مرتبہ ڈاکٹر ظہیر پرویز، ص 712

☆☆☆

کشمیر میں دین اسلام کے مبلغ میر سید علی ہمدانی کی سوانح حیات اور ادبی کارنامہ

مبارکہ موسوی
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی

خلاصہ:-

میر سید علی ہمدانی آٹھویں صدی ہجری کے ایک بہت ہی بڑے عالم، شاعر، عارف اور صوفی تھے۔ان کی ہمدان میں ولادت ہوئی۔وہ سلسلہ کبرویہ کے بہت بڑے عالم اور بزرگوں میں سے تھے۔اپنے زندگی کے اوائل میں، انہوں نے وسیع تربیت حاصل کی اور ان کو بہت عظیم اور معزز عالموں نے پڑھایا۔انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت سفر کیا۔ان کی طرز زندگی اور مختلف ممالک کے سفر نے انہیں تصوف کی طرف لے گیا۔علماء، عرفاء اور صوفیوں کے درمیان میں ان کا مقام بلند تھا۔اگر صحیح میں کہا جائے تو یہ لفظ حسنہ الدنیا والآخرہ کا حقیقی رہنما رہا ہے۔آپ نے اپنی پوری زندگی دین اسلام کی رہنمائی اور اس کی تبلیغ میں صرف کی اور خود ایک کامل شخص، بہترین نمونہ اور دین کے سچے مسلمان رہنما بن گئے۔سید نے حکمرانوں سے اسلام اور انصاف کو قبول کرنے کا دعوت بھی دیا تھا۔ مجالس کا انعقاد، وعظ و نصیحت کرنا، دین اسلام کی تعلیم دینا، طلبہ اور مبلغوں کی تربیت کرنا، تبلیغ کے لیے باقاعدہ اور بڑی تنظیمیں قائم کرنا، مباحثے کا انعقاد، مساجد، خانقاہیں اور کتب خانے بنانا، کتابیں اور رسالہ میں لکھنا، فارسی زبان و ہنر اور اسلامی ایران کی فرھنگ کی خدمت کرنا اور مختلف ملکوں کا سفر کرنا خصوصاً شہر کشمیر کا ان کے اہم ترین کاموں میں سے تھا۔اس مضمون کا اصلی مقصد یہ ہے کہ تصوف، ثقافت اور فن کے حوالے سے سید کے نقطہ نظر کا پوری طرح احاطہ یا جا سکے۔

کلیدی الفاظ:۔میر سید علی ہمدانی، ہمدانی کا نقطہ نظر، عرفان، تصوف، فن۔

تعارف:-

اس مضمون میں دنیائے ادب اور تصوف کی ایک ممتاز شخصیت اور علم و بصیرت کے مالک، طریقہ کار کردار اور اسلامی علم کی ترقی، ایرانی ثقافت کی وسعت اور ترقی کے میدان میں کام کرنے والی دنیا کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ با کردار شخصیت میر سید علی ہمدانی ہے۔ پورا نام میر سید علی ہمدانی امیر سید علی بن شہاب ہے۔ آپ کی ولادت ۱۲ رجب ۱۳۱۴ء کو ہمدان شہر میں محمد خدابندہ (اولجایتو ایلخانی پادشاہ) کے دور میں ہوئی۔ بچپن ہی سے اسلام کی طرف مائل تھے اور حافظ قرآن بھی ہو گئے۔ انہوں نے فارسی اور تاجی ادب کے سرکاری علوم، اخلاقیات، سیاسیات، دینیات، فقہ، تہذیب و تصوف، حدیث، تفسیر وغیرہ کی عملی حکمتیں اور بعد میں ان تمام علوم کو جلد ہی سیکھ لیا۔ اس طرح آپ نے لوگوں کی خدمت کی اور علم و تقوی میں تمام مصائب برداشت کرنے کے بعد اعلی مقام پر پہنچ گئے۔ وہ کبروئی خاندان کے عظیم لوگوں میں سے تھے۔ اور آٹھویں صدی کے مشہور عالم اور شاعروں میں سے تھے۔ وہ اسلام کے بڑے مبلغین میں سے تھے، جنہوں نے دین اسلام کی بہت خدمت کی۔ انہیں شاہ ہمدان، امیر کبیر اور حضرت علی ثانی بھی کہا گیا ہے۔ میر سید علی ہمدانی اپنے والد کے نسب سے مولای متقیان علی بن ابی طالب کے نسل سے ہیں۔ اسی طرح سے وہ اصلی سادات علوی حسینی میں سے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب اختصار المناقب میں اس طرح مذکور ہے:۔ سید علی بن شہاب الدین بن محمد بن علی بن یوسف بن محمد بن جعفر بن عبداللہ بن محمد بن علی بن حسین بن حسین بن علی زین العابدین بن حسین بن علی علیہ السلام (تاریخ ادب فارسی در پاکستان)۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اکثر جگہوں پر ان کا تخلص علائی رکھا گیا تھا۔ درس و تدریس میں بہت صلاحیت اور ہنر رکھتے تھے۔ جوانی میں شیخ ابوالبرکات تقی الدین علی کے شاگرد ہوئے۔ ان کے وفات کے بعد انہوں نے اپنے ماموں سید علاء الدولہ سمنانی سے تصوف کے اسرار سیکھ لیے۔ سمنانی نے میر سید کی تربیت میں بہت محنت کی اور ان کے عہدے اور تربیت کی وجہ سے میر سید علی شریعت اور طریقت کے رہنما اور ہمدانیہ خاندان کے قطبوں میں سے ایک بن گئے۔ آٹھویں صدی ہجری میں تیمور لنگ کا قتل و غارت گری عروج پر پہنچ گئی اور اس قتل و غارت گری کی وجہ سے میر سید کو سات سو سادات اور ان کے پیروکاروں کے سات ہجرت کرنی پڑی۔ ان سات سو لوگوں میں سے فنکار، صوفی،

معمار اور سنگ تراش شامل تھے جو میر سید کے ساتھ ہمدان اور سمنان سے آئے تھے۔ میر سید بالآخر برصغیر پاک و ہند کے کشمیر کے علاقے میں علاء الدین پورہ (سرینگر) میں اقامت اختیار کی۔ انہوں نے جموں کشمیر، گلگت اور بلتستان میں لاکھوں لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دی۔ لوگ آپ کی شخصیت، فضائل اور کمالات سے بہت متاثر ہوئے اور دین اسلام کو قبول کیا۔ ہزاروں لوگوں کے مسلمان ہونے کے بعد ایران کی تہذیب وتمدن اور فارسی زبان میں تحریر کا رواج عام ہوا۔ خصوصا سلطان اسکندر کے دور میں یہ زبان بہت ترقی کر گئے اور سلطان زین العابدین کے دور میں یہ فارسی علم وادب اپنے عروج پر پہنچ گئے۔

کشمیر کا ایران کے ساتھ پرانے ثقافتی اور روحانی تعلقات ہیں۔ اس کی ثقافت اور تہذیب اعلیٰ انسانی اور اسلامی اقدار سے نکلتی ہے اور اس کی تنظیم ایرانی ثقافتی اقدار پر مبنی ہے۔ خط لداخ کے ایک شہزادے نے کشمیر کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان صدرالدین ثانی کے نام سے کشمیر پر حکومت کی۔ اسلام نے سرکاری طور پر اس زمینی جنت کو اپنی چمکیلی روشنی سے منور کیا۔ اس سرزمین اور اس کے گردونواح میں میر سید علی ہمدانی کی آمد اور اسلام کے فروغ سے کشمیر کی ثقافتی اور روحانی بنیادیں پڑ گئیں۔ برصغیر پاک و ہند کے کسی بھی دوسرے خطہ سے زیادہ ایرانی مشنریوں اور صوفیاء نے کشمیر کو متاثر کیا۔ آج دستکاری سے لے کر ایرانی لوگوں کے رسم ورواج تک اس پر خاص اثر پڑا ہے اور اسی لیے کشمیر کو ایران صغیر کہا جاتا ہے۔ کشمیر میں اسلام کا پھیلاؤ، ہندوستانی راجہ کا اسلام قبول کرنے کے ساتھ ہوا جو اس ملک کے بدھ حکمران تھے جو بعد میں صدرالدین کے نام سے مشہور ہوا۔ انہوں نے بلبل شاہ نامی ایک مسلمان مشنری اور اس کی عظیم سرگرمی کی وجہ سے اور میر سید علی کی فعالیت کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ کشمیر کے بادشاہ قطب الدین اور شہاب الدین میر سید علی ہمدانی کا بہت احترام کرتے تھے اور میر سید کے مقاصد اور منزلوں میں ان کی بہت مدد کرتے تھے۔ میر سید کے سات سو سیدوں اور اصحاب نے جو مختلف فنی اور سائنسی شعبوں میں ماہر تھے، اس سرزمین کے مسلمانوں کو اسلام کی ترقی کے راہ پر گامزن کیا۔ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ میر سید علی ہمدانی نے خود سینتیس ہزار لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا اور اسلام قبول کرنے میں کامیاب ہوئے۔ میر سید کے دانشمندانہ افکار کی وجہ سے اہل کشمیر کے تمام بت

ٹوٹ گئے اور وہ بت شکن کے نام سے مشہور ہوئے۔ (طرائق الحقایق)، (مجالس المومنین) اور (تاریخ نظم ونثر درایران)۔

کشمیر میں میر سید علی ہمدانی اور ان کے ساتھیوں نے اسلامی اور ایرانی ثقافت کو اچھی طرح پہنچایا۔ اس حوالے سے علامہ محمد اقبال جاوید نامہ میں فارسی زبان میں فرماتے ہیں:۔

گفت رومی آنچہ می آید نگر — دل مدہ با آنچہ بگذشت ای پسر
شاعر رنگین لوا، طاہر غنی — فقر او باطن غنی ظاہر غنی
نغمہ ای می خواند آن مست مدام — در حضور سید والا مقام
سید سادات سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ھو گرفت — ذکر و فکر از دود مان او گرفت
سید آن کشور مین و نظیر — میر و درویش و سلاطین را مشیر
خطہ را، آن شاہ دریا آستین — داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آن مرد، "ایران صغیر" — با ھنر ھای غریب و دلپذیر
یک نگاہ او گشاید صد گرہ — خیز و تیرش را بدل راھی بدہ!

(جاوید نامہ)

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ کوئی بھی شخص میر سید علی ہمدانی کی صلاحیت پر نہ پہنچ سکے۔ بہت سی شخصیات دور دراز علاقہ سے برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ کے لیے تشریف لائے تھے لیکن میر سید علی ہمدانی کے جتنا با اثر کوئی نہیں تھا۔ میر سید نے دنیا دیکھی تھی اور بڑی مشکل سے ہندوستان کا سفر کیا تھا اور کشمیر میں اپنے نہایت ماہر علوی ساتھیوں کے ساتھ اور اپنے مختلف کاموں کے ساتھ قیام کیا تھا۔ اور اپنے مختلف کاموں سے لوگوں کو ایرانی ثقافت کے بارے میں سکھایا اور اس مختصر وقت میں کشمیر کو پوری دنیا میں مشہور کیا۔ دین اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس نے طلباء اور مبلغوں کو تعلیم دینے کے لیے اسلامی تعلیمات بھی سکھائیں اور لوگوں کو توحید سے ڈھانپنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اور اس مرحلے پر وہ ایک فنکار تھے اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ میر سید بہت مخلص تھے اور صبح کے نماز کے بعد تلاوت کرتے تھے اور تلاوت کے بعد ایک اونچی جگہ پر بیٹھ کر نہایت میٹھے اور پرکشش لہجے

میں لوگوں کو اپنا درس سناتے تھے۔ ایسے پر کشش لہجے سے عام لوگ بہ خوبی درک کرتے تھے۔ لوگوں کو بہت زیادہ نصیحتیں کرتے تھے۔ خود ایک بہت خالص صوفی تھے اور تصوف اور عبادت سے بہ خوبی واقف تھے۔ انہوں نے لوگوں کو دس بنیادی اصول سکھائے اور ان کی وضاحت کے لیے انہوں نے دس اصولوں کا مقالہ لکھا۔ ان اصولوں میں ان کی تعلیمات کا خلاصہ شامل ہے۔ جن کے عنوانات ہیں توبہ، زھد، توکل، قناعت، عزلت، ذکر، توجہ، صبر، مراقبہ، رضا۔

میر سید نے اخلاقی تعلیم اور اسلامی علم سکھانے کے لیے فارسی زبان کا انتخاب کیا۔ ان کے بہت سے کتابیں اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو گئے ہیں۔ طلبہ اور مبلغوں کو سکھانے کے لیے سائنسی، فنی اور انتظامی کام بھی کیا۔ انہوں نے بنائی کے فن کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ قالین کی بنائی کے علاوہ انہوں نے کشمیر کے علاقے میں قالین بنائی، لکڑی پر نقش ونگار، چاندی کے برتن، مٹی کے برتن وغیرہ بھی انہوں نے کشمیر میں رائج کیا۔ انہی کی وجہ سے کشمیر دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ سرینگر اور بلتستان اور دیگر جگہوں پر بہت بڑے سکول اور خانقاہیں تعمیر کی گئیں۔ رسالہ مستورات کے مصنف کے مطابق، میر سید کشمیر کے لوگوں کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے اس قدر متاثر کیا کہ لوگوں نے مندروں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا۔ میر سید بنیادی طور پر خاص اور منفرد خصوصیات کے حامل تھے جنہوں نے انہیں کامیاب اور قابل فخر بنایا۔ اپنی علمی فضیلت اور آزادی روحیہ کے جذبے کی وجہ سے وہ تیمور اور ظالم بادشاہوں کے حکمرانوں سے بھی درگیر ہو گیا۔ اور اسی طرح انہوں نے اس راہ میں بہت سی تکالیف اور مصیبتیں برداشت کیں۔ وہ قدرت سے مالا مال تھا اور عظیم روحانی، معنوی اور علمی حیثیت کے باوجود انہوں نے اپنی روزی وقت کے حکمرانوں سے نہیں بلکہ محنت، کاریگری اور تعمیری سرگرمیوں سے مہیا کی۔ میر سید علی کی کامیابی اور عروج ان کی مراغات یافتہ اور قابل تعریف خصوصیات میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنی علمی فضیلت کے ذریعہ جب بادشاہوں اور تیمور حکمرانوں سے درگیر ہو گیا تھا سارے مسائل کو حل کرتے حق کے راہ میں قائم رہا۔ خود کی اور اپنے خاندان کی فرائض کو بہ خوبی انجام دیا اور حلال کمائی سے ہی اپنے خاندان کا پیٹ بھرتا رہا۔ اور جب حاکم وقت اور عوام ان سے ملنے آتے تھے تو وہ کسی سے بھی تحفہ قبول نہیں کرتے تھے۔ غریبوں اور ضرورتمندوں کی مدد کرتے تھے اور اپنے مریدوں سے التجا بھی کرتے تھے

کہ حلال کمائے اور حلال کھائے اور دوسروں کے لیے بھی فائدہ پہنچائے۔ان کی ایک اور خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی کسی کے بارے میں برا نہیں کہا۔علم و ہنر اور تقوی ان کا اہم سرمایہ تھا۔ان کی نظر میں سب سے اہم ترین چیز کتاب تھا اور انہوں نے بہت سے رسالہ اور کتاب بھی تالیف کیے۔انہوں نے فارسی اور عربی زبان میں مختلف اسلامی علوم، تصوف، اخلاقیات، ادب، حدیث، سفر اور ائمہ کی زندگی پر مقالے چھوڑے ہیں۔بادشاہوں اور شہزادوں کو بھیجے گئے خطوط کے مجموعہ میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہیں بہترین لہجے میں نصیحت کی گئی تھی۔انہی صفاتوں کی وجہ سے وہ لوگوں میں کے دل میں عزیز ہیں۔اشارہ کے طور پر ان کا ایک نامہ جو انہوں نے فارسی زبان میں اپنے ہم عصر بادشاہوں کے لیے لکھے گئے تھے ہیں، یہ خط بہت سادہ ہے اور بے تکلف ہے۔انہوں نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:-

"روز قیامت کار پادشاہ و حاکم از ہمہ سخت تر است۔۔۔۔اگر آن روز توقع عضو و غفران داری از آن حضرت، امروز با بندگان او بہ عدل و احسان معاملہ کن و این، وقتی میسر شود کہ پیران رعایا را چون فرزند باشی و نو جوانان را چون برادر و طفلان را چون پدر و مظلومان را ناصر و ظالمان را قامع و فاجران را فاضح و تایبان را ناصح و مطیعان را معین و در قول صادق و در عہد واثق و در نعمت شاکر و در محنت صابر و در عمل مخلص و در رفعت متواضع و در جمال پارسا۔

ای عزیز! پادشاہ، امین و وکیل و خزانہ دار حق است. برتو باد کہ در خزانہ حق بہ ہوای نفس و تسویل شیطان تصرف نکنی و آنچہ بگیری، بہ حق گیری و حق بہ مستحق رسانی تا در عذاب و فضیحت ہول فزع اکبر نمانی۔۔ای عزیز! اگر در ولایت تو یک گرسنہ یا برہنہ یا ظلم رسیدہ باشد و تو را از حال وی خبر نبود و تفقد حال وی نکنی، تو را از مرتبہ اہل تقوا نصیب نیست''۔(احوال و آثار میر سید علی ہمدانی)۔

تالیف و تصنیف:۔

میر سید کا شمار ایران کے با اثر مصنفیں میں ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر اور بلتستان کے لوگوں کو اپنی تصریحات سے متاثر کیا۔انہوں نے صوفیانہ، اخلاقی اور طرز عمل کے مسائل پر فارسی اور عربی میں ۷۰ کتابیں اور مقالے تصنیف کیے ہیں۔جن میں سے ذخیرہ الملوک سب سے مشہور ہے۔فتوت نامہ، منہاج العارفین، شرح بر فصوص ابن عربی، شرح منظومہ ابن فارض، شرح اسماء

الحسنی، مجمع الاحادیث، آداب المریدین، مرآت التائبین، رسالہ ذکریہ، رسالہ وجودیہ، رسالہ منامیہ، رسالہ عقبات، رسالہ فی الطب، رسالہ آداب سفرہ، رسالہ اصطلاحات، واردات غیبیہ، سرّ الطالبین، انتخاب منطق الطیر، علم القیافہ، موّدۃ القربی، مکارم الاخلاق، چہل اسرار، مکتوبات و مستورات، درمعرفت صورت وسیرت انسان، درحقائق توبہ، دربیان روح ونفس، ورسالہ ہمدانیہ جو توضیحی رسالہ ہے۔ان کے کچھ کتابیں اور رسالہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔اور کچھ پیرس کی نیشنل لائبریری میں ہیں۔اوران کے کچھ اہم کتابیں دنیا کے کئی زبانوں میں ترجمہ ہوگیا ہے جو بہت سادہ اور دل نشین ہے۔کتاب ذخیرۃ الملوک دہ باب پر مشتمل ہے۔ان کا ایک اور رسالہ "رسالہ فقریہ" کے نام سے ملک شرف الدین خضر شاہ کے سفارش سے تحریر ہوئی ہے۔اور یہ رسالہ "آداب وسیر اہل کمال" اور "نسبت خرقہ پوشی ہم بین ہمدانی شناساں" کے نام سے بھی معروف ہے۔رسالہ دوادیہ ان کے ارشاد نامہ میں سے ہے جو بہت اہم مطالبات اس میں شامل ہیں۔اور یہ رسالہ صوفی حضرات اور عارفوں کے بھیج بہت رائج تھا۔رسالہ فتوتیہ میر سید علی ہمدانی کے فتوت اور جواں مردی کے بارے میں ہیں۔اورفتوی کے معنی اوراس کے پس منظر میں اور لفظ اخی کے معنی کی تشریح اور عام معنی اور خاص معنی جو کہ دلوں کے مالک ہو۔تحقیق اورفتوی کے مقام کے متلاشی کے درمیان ایک اصلاح ہے۔رسالہ عقبات بھی ان کی اہم ترین آثاروں میں سے ایک ہے۔جو "قدوسیہ" اورحقیقت ایمان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔یہ رسالہ میر سید نے سلطان قطب الدین کے سفارش سے لکھے تھے اوراس میں اسے بادشاہت کے نتایج اور فرائض سے آگاہ کیا ہے۔کہ مسلمان بادشاہ کی سب سے بڑی جانشینی یہ ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے لیے انصاف اورعملی مساوات کا حصول ہو۔ایک نامہ میں فارسی زباں میں ان سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "حقیقت این است کہ ای عزیز! اگر دینداری آن است کہ صحابہ وتابعین داشتند و مسلمانی آن کہ درقرن اول ورزیدند، جای آن است کہ گبران ومغان ازتر ادامنی ما ننگ دارند۔۔

گر برہمن حال من بیند، براندازد درم
زآنکہ چون من بدکنش راپیش بت ہم بار نیست
زہر بدی کہ تو دانی، ہزار چندانم

کسی چہ داند آن بدزمن کہ من دانم؟

مکتوبات امیریہ ان کے ایک اور دست نویسوں میں سے ایک ہے۔اس خط میں کشمیر کے مشہور بادشاہ سلطان قطب الدین شاہ میری سے مخاطب ہوئے ہیں۔ان کہ ایک اور آثاروں میں سے ایک ''چہل اسرار'' ہے جو چالیس عارفانہ غزلوں میں شامل ہے۔انہوں نے یہ غزل ایک ہی رات میں اپنے مریدوں کے لیے لکھے تھے۔کچھ بیت:۔

گر دمی وصلش بہ صد جانت میّسر می شود

روگرانجانی مکن، چون دوست ارزان می کند

چون ہمای قاف قربی، بال ہمت برگشای

درفضای لامکان باقدسیان انباز شو

ای ''علی'' لفظ ما و من حق است

چون زما بگذری چہ ماند؟ حق (چہل اسرار یا غزلیات میر سید علی ہمدانی)

میر سید کی تخلیقات کا مجموعہ فکری قوت اور قابلیت کو ظاہر کرتا ہے،انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے صرف کیا اور اپنے وعظ و نصیحت سے لوگوں کو متاثر کیا۔تعلیمی، رہنمائی اور سماجی سرگرمیوں میں وسیع تر مواقع پیدا کرنے کے وسیع مطالعے اور تجربیات کو بہترین تحریر کیا گیا۔

نتیجہ:۔

میر سید نے ایرانی اور فارسی بولنے والے صوفیاء کے درمیان سب سے زیادہ اسلام کی تبلیغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ عرفاء سہروردہ، قادریہ اور چشتیہ جیسے فرقوں کے بانی تھے اور برصغیر پاک و ہند میں درسگاہیں اور تربیتی مراکز قائم کیے تھے۔ ہندوستان میں خصوصا کشمیر میں انہوں نے لوگوں کو دین اسلام سے زیادہ متاثر کیا اور دین اسلام کی طرف لوگوں کو مائل کیا اور ایرانی کلچر کو کشمیر میں رائج کیا کہ بعد میں جا کر کشمیر کو ایران صغیر کے نام سے جانا گیا۔ان کا سیاسی فلسفہ مکمل انسان دوست تھا جس میں انسانی ذہن کی آزادی، بھایی چارے اور اجتماعی حکمرانی اور سماجی انصاف کی مساوات تھی۔ یقیناً اس عظیم انسان کا کردار اور طرز زندگی منفرد تھا جس نے مذہب،

ثقافت، ادب، تصوف، فن کے لیے منفرد کردار ادا کیا۔ اس عظیم ہستی کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے پھر بھی کم ہے۔ ۳۷ سال ک عمر میں گذر گئے اور تاجکستان میں دفن کیے گیے۔ ان کا مزار ہزاروں لوگوں کے لیے اب زیارتگاہ بن چکے ہیں۔ مولانا یعقوب صرفی کشمیری نے سید کے مزار شریف کو اس طرح بیان کیا ہے:-

بہ کولاب ابدالیم رونمود
بہ اسرار پنہان وکنہ وجود
مشرف شد آنجا فقیر حقیر
بہ طرف مزار امیر کبیر
(مغازی النبی)

فوٹ نوٹ:-

احوال وآثار میر سید علی ہمدانی..n.d

تاریخ ادب فارسی در پاکستان..n.d

تاریخ نظم ونثر در ایران..n.d

چہل اسرار یا غزلیات میر سید علی ہمدانی. ۵ جلد. وحید, ۱۳۴۷ آبان.

طرائق الحقایق. ۲ جلد..n.d

کلیات اشعار فارسی مولانا اقبال..n.d

مجالس المومنین..n.d

مغازی النبی..n.d

حوالہ جات:۔

۱۔آفتاب رای لکھنوی(۱۳۶۱ش)،ریاض العارفین،تصحیح حسام الدین راشدی،اسلام آباد،مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

۲۔آزاد،سید محمود(۰۹۹۱م)،تاریخ کشمیر،مظفر آباد۔۔سیادت پلیکیشنز

۳۔اذکایی،پرویز(۱۳۷۰ش)،مروج اسلام در ایران صغیر،آمدان

۴۔بدخشی،نورالدین،جعفر(۱۳۷۴)،خلاصہ المناقب،تصحیح سیدہ اشرف ظفر،اسلام آباد،مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

۵۔جامی،عبدالرحمٰن(۱۳۷۵ش)،نفحات الانس،آران،علمی۔

۶۔دکتر محمد ریاض،احوال و آثار و اشعار میر سید علی آمدانی،ص۳۔۹۶،مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان،اسلام آباد،۱۹۹۱

۷۔ریاض،محمد(۴۶۳۱)،احوال و آثار و اشعار میر سید علی ہمدانی،اسلام آباد،مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔

۸۔سیوہاروی،قاضی ظہور الحسین(۲۵۳۱ق)،دہلی۔

۹۔سعید نفیسی،تاریخ نظم و نثر فارسی در ایران و در زبان فارسی،ج۲ص۳۵۷۔

۱۰۔صفا،ذبیح اللہ(۳۷۳۱)،تاریخ ادبیات ایران،تہران،فردوس۔

۱۱۔فریدون تقی زادہ طوسی،دیباچہ در رسالہ ذکریہ،ص۷،موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی،تہران،۱۹۹۲۔

۱۲۔محمد خواجوی،احوال و آثار میر سید علی ہمدانی در دیباچہ مشارب الاذواق،ص۴۲،انتشارات مولی،خیابان انقلاب،چہارراہ ابوریحان،تہران،۱۹۸۴۔

۱۳۔مسکین،محی الدین(۹۳۳۱)،تحایف الاسرار،آند،چاپ امرتسر۔

۱۴۔معصوم شیرازی،محمد(۸۱۳۱ش)،طرایق الحقایق،با تصحیح محمد جعفر محجوب،تہران،بارانی۔

۱۵۔نفیسی،سعید،(۴۴۳۱)،تاریخ نظم و نثر در ایران،تہران،فروغی۔

علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا ادبی جائزہ

آصف علی احمد
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی،
یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر

تلخیص:

علامہ اقبالؒ ان برجستہ ترین اور عظیم ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ آپؒ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ہندوستان کی سرزمین سے نکل کر مغربی تہذیب میں رہ کر اہل مغرب کی تہذیب وتمدن کے تجزیہ وتحلیل اور ان کے خطرناک نتائج سے اپنی قوم اور ملت کو بیدار کرنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ آپؒ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے اردو اور فارسی شاعروں میں بہت بلند اور اعلیٰ مرتبے کے حامل ہیں۔ آپؒ کی شخصیت تخیل کی عظمت، نظر کی وسعت، فکر کی رفعت اور ترجمانی حقیقت ومعرفت کے اعتبار سے لاثانی و بے مثال ہے۔ آپؒ نہ فقط ایک شاعر تھے بلکہ ایک عظیم فلسفی، مفکر اور سیاستدان بھی تھے۔ آپؒ اس جہان میں مختلف القابات جیسے شاعر مشرق، حکیم الامت، مصور پاکستان، علامہ، سر اور مفکر اسلام سے معروف ہیں۔ جنہوں نے اپنے تخیلات اور افکار کو ذریعہ بلاغت بنا کر اس خواب غفلت میں محو ملت اور قوم کو بیدار کرنے کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے ذریعے ایک تحریک پیدا کی۔ آپؒ اپنے روحانی مرشد جلال الدین رومیؒ کی طرح اسرار حیات کے رمز شناس بھی تھے۔ آپؒ نیا پنے متقدمین کے افکار اور تخیلات کو اپنی شاعری میں سمو دیا اور عصر رواں کے فتنہ کا مقابلہ کیا۔ آپؒ نیا پنی شاعری میں مختلف اور دقیق موضوعات اور اسلامی عقائد جیسے انسان کی تخلیق کے مقاصد، فلسفہ خودی، انسان کی عظمت ومقام،

مسلمان عورتوں کی عظمت، وحدت الوجود، وحدت الشھود اور عشق ومحبت رسولؐ کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور اجتماعی مسائل کو بھی نہایت ہی مدلل طریقے سے رقم کیا ہے۔ اسلامی طرز وطریق کے ساتھ اپنی قوم اور ملت کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ آپؒ کی منظوم اور منثور تخلیقات میں فارسی تخلیقات اردو کی بنسبت زیادہ ہیں جن تقریباً دوتہائی حصہ فارسی میں اور ایک تہائی حصہ اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: مقصد تخلیق آدم، مرتبہ انسان، عظمت خواتین، فلسفہ خودی، مغربی تہذیب، پیغام اقبالؒ، اقوام مشرق

علامہ اقبال ہندوستان کی ریاست پنجاب کی سرزمین سیالکوٹ (موجودہ پاکستان) میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ عیسوی کو شیخ نور محمد کے گھر میں پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد جو ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے علامہ اقبالؒ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی کی اس کے بعد ایک مدرسے میں سید میر حسن کی شاگردی میں بھیجا وہاں علامہؒ نے سید میر حسن سے فارسی اور عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامیات اور حکمت کے درس نے علامہ اقبالؒ کے علم وادب میں گراں بہا اضافہ کیا، جس کی تابناکیوں سے سارا جہان روشن ومنور ہوگیا۔ علامہ اقبال بچپن سے ہی علم وفراست کے مالک اور حاضر جواب تھے۔ ایک دن اسکول میں استاد نے تاخیر کی وجہ دریافت کرنا چاہی تو علامہؒ نے جواب دیا کہ ''اقبال دیر ہی میں آتا ہے''۔(۱)

علامہ اقبالؒ نے مذہبی تعلیم کے علاوہ انگریزی تعلیم میں میونچ یونیورسٹی (جرمنی) سے ''ایران کے فلسفہ مابعد الطبعیات'' مقالہ پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ انگلستان میں اس مقالہ کی اشاعت کے بعد علامہؒ کی قابلیت کو دیکھ کر پروفیسر آرنلڈ نے لنڈن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیے اس کے بعد ہندوستان آئے تو اورینٹل کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے لیکن آپ نے پروفیسری ترک کردی اور بیریسٹری میں لگ گئے۔ اس کے بعد سیاست میں بھی کافی حد تک حصہ لیتے رہے۔ ۳۲ نومبر ۱۹۲۶ عیسوی میں لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ عیسوی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی، اس کے بعد مسلم کانفرنس کے صدر بنے اور ۱۹۳۱ عیسوی میں دوسری رونڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے انگلسان گئے

اور واپسی پر مصر اور روم کیسفر میں مختلف سیاسی انجمنون میں لکچر دیے۔اسی طرح ہندوستان میں بھی مختلف مقامات پر سیاست میں مشغول ہوتے رہے۔آخر میں بریسٹری کا امتحان بھی پاس کرنے کے بعد وکالت اختیار کی اور آخری عمر میں وکالت بھی ترک کر دی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔اس کے بعد علامہؒ تین سال کی علالت کے بعد ۶۵ سال تک علم وادب کے شائقین کے لیے ضوفشانی کر کے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ عیسوی کو صبح پانچ بجے روح اس قفس عنصری سے پرواز کر گی،اس طرح اس جہان میں اپنے چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے کر علم وادب کا یہ درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور پنے مالک حقیقی سے جاملا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادبی کارنامے:

علامہ اقبالؒ وہ عظیم شخصیت ہیں جن کو دنیا نہ فقط ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے بلکہ ایک مفکر اسلام،فلسفی،سیاستدان،اور ترجمان حقیقت ومعرفت ان سے بڑھ کر ایک عاشق رسولؐ کی حیثیت سے بھی جانتی ہے۔آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں بلکہ خود آپ کے علمی اور ادبی کارنامے آپ کی پہچان ہیں۔آپ نے اپنے فکر وفن کا سحر آفرین اظہار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بالخصوص اپنے تفکرات اور تخیلات کو اس شریں اور دلکش زبان (فارسی) میں نہایت جامع انداز میں فارسی زبان پیش میں کیا ہے۔آپؒ کا فلسفہ کلام نہ صرف فلسفہ حیات کی مکمل تفسیر ہے،بلکہ آپ کے جمالیاتی ذوق کی بھی پوری طرح عکاسی کرتا ہے،آپؒ کی شاعری میں خودی، عشق،فقر،عظمت انسانی،مذہب وسیاست،تصوف،جبر وقدر،اپنی قوم وملت کی بیداری جیسے اہم مضامین ہیں۔آپ نے اپنی شاعری میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی اور بابا طاہر عریاں کی رباعیات کی پیروی کی ہے۔علامہ اقبال کی تخلیقات کے نام اس طرح ہیں۔

بانگ درا،ضرب کلیم،بال جبرئیل اردو زبان میں تحریر کی ہیں اور فارسی اصناف سخن میں زیادہ کمال دکھایا ہے۔فارسی تخلیقات میں پیام مشرق،ارمغان حجاز،زبور عجم،پس چہ باید کردای اقوام شرق،اسرار خودی،رموز بیخودی،جاوید نامہ قابل ذکر ہیں،جن کو میں الگ الگ اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی سعی کروں گا۔

ا۔مثنوی اسرار خودی ۱۹۵۱ عیسوی میں شائع ہوئی جو یورپ اور امریکہ میں اقبال کی شہرت کا باعث

بنی۔ ڈاکٹر نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اس کتاب پر بہت سے خیالات صرف کیے گئے۔جس کی وجہ سے یورپ اور امریکہ کو اقبال کے افکار سے آشنائی کے مواقع فراہم ہوئے۔اس مثنوی میں علامہ اقبال نے ایک ضابطہ حیات ، فلسفہ وحدت الوجود اور فلسفہ خودی کو نہائت ہی دلنشین، مفسرانہ اور مفکرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جو ایک شاعر کے انداز فکر سے بالکل الگ اور جدا ہے، شاعر کی فکر میں یہ ترتیب، باقاعدگی اور استدلالی شان کہاں ہوتی ہے جیسے علامہؒ نے اپنے کلام میں قرآن واحادیث کی آیات و دلائل سے مختلف دقیق موضوعات کو بیان کیا ہے۔ یوں تو اقبال کے کلام میں فلسفیانہ کلام کی اس قدر بہتات ہے کہ شاید کسی دوسرے شاعر کہ یہاں ہو۔ یہی وہ واحد شخصیت ہے جس نے جمال الدین افغانی کے بعد سرزمین پنجاب سے اٹھ کر اپنی قوم کو بیدار کیا اور جس نے سب سے پہلے خودی کے مفہوم کو شاعرانہ انداز میں اس طرح واضح کیا۔

یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ راز درون حیات — خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من وتو میں پیدا، من وتو سے پاک
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامن
سفر کا آغاز وانجام ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے

(بال جبرئیل، ساقی نامہ)

اس مثنوی میں خودی کی حقیقت اور اس کے مبادیات سے بحث کی گئی ہے دو حصوں پر مشتمل یہ مثنوی جس کے پہلے حصے میں خودی اور دوسرے حصے میں اسلامی اخلاقیات کے عام اصولوں کو تفسیر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فلسفہ کے بنیادی اصول اسرار خودی اور رموز بیخودی میں بیان فرماتے ہیں کہ خودی ایک نظام عالم ہے، خودی نہ ہو تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے، جیسا کہ اشعار میں بیان کیا ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
بہر یک گل خون صد گلشن کند — از پئے یک نغمہ صد شیون کند
عذر این اسراف واین سنگین دلی — خلق وتکمیل جمال معنوی

سوز پیہم قسمت پروانہ ہا — شمع عذر محنت پروانہ ہا

خامہ ءاو نقش صد امروز بست — تا بیارد صبح فردائی بدست

شعلہ ہای او صد ابراہیم سوخت — تا چراغ یک محمد برفروخت

کائنات کی تخلیق اسی نہج پر رکھی گئی ہے کہ اس جہاں میں ہر جگہ خصومت اور خونریزی نظر آتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت ہر وقت غارت گری اور تباہ کاری پر کمر بستہ ہے لیکن اس خونریزی سے جمال معنوی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ انسان کی فطرت مالک ہر دو جہاں نے یہ خوبی رکھی ہے جس سے ترقی کی منازل طے کرتا ہے اور ہر وقت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ اس سرزمین پر فتنے اور جنگ وجدل میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ کئی بے گناہ جانوں کا خون کر دیتا ہے، کئی بستیوں اور کئی باغوں کی رونق کو پائمال کر دیتا ہے اور خود سرور حاصل کرتا ہے اس طرح انسان اپنی فطرت پر کمر بستہ ہوتا ہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہے تا کہ جمال معنوی کی تکمیل ہو سکے۔ جس طرح انسان تھوڑی سی مشک کی خاطر بہت سی ہرنوں کا پیٹ بلا تامل چاک کر دیتا ہے، گلدستہ بنانے کے لیے بہت سے درختوں سے پھول چرا کر بیرونق کر دیتا ہے، ایک طالب علم اپنی ہزار راتوں کی نیند کو قربان کر کے ڈگری حاصل کرتا ہے۔ یہ سب اسی خودی کا کمال ہے جو اللہ رب العزت نے انسان کی فطرت میں رکھی ہے جو بظاہر خونریزی کرتی ہے لیکن حقیقت میں جمال وکمال اسی خودی سے حاصل ہوتے ہیں۔ خودی عشق ومحبت سے استحکام پاتی ہے۔ خودی ہی کے ذریعے انسان کے اندر کائنات کے فتح کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس ہی سے انسان خود شناس اور خدا شناس بنتا ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرمانده عالم شود

یہ ایک ایسا جذبہ محبت ہے جو انسان کے ضمیر میں پوشیدہ ہے جس کو علامہ نے اپنے کلام میں نقطہ نور کہا ہے۔ اس کی طاقتیں اس قدر عظیم الشان ہیں کہ عقل وشعور ان کا ادراک نہیں کر سکتی، جس طرح عقل انسانی اپنی ترکیب کے لحاظ سے کل کو نہیں دیکھ سکتی وہ صرف جزئیات کا ادراک کر سکتی ہے، کل کو دیکھنے کی طاقت صرف کشف میں ہے جو عقل سے بالاتر قوت کا ادراک کر سکتی ہے اور عقل کی دسترس سے ماوری ہے، جس طرح چاند کی فطرت ہے زمین کے گرد چکر کاٹنا، زمین

کی فطرت سورج کے گرد کیونکہ سورج کی ہستی زمین سے زیادہ استوار ہے یہ سب ان کی فطرت میں ہے پانی کی فطرت بہنا، ہوا کی فطرت چلنا اور آفتاب کی فطرت چمکنا، اسی طرح اے انسان تیرے اندر اللہ رب العزت نے یہ تمام خوبیاں رکھیں ہیں تو ان تمام سے برتر ہے۔ تجھے اللہ نے تمام صلاحیت سے نوازا ہے تا کہ جس مقصد کے لیے تجھے پیدا کیا گیا ہے تو اس مقصد میں کامیابی حاصل کرے، اس طرح تو بھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کر، کیونکہ خودی کی زندگی اور بقا تلاش و پیہم اور سعی مسلسل پر موقوف ہے جو تیرے اندر ودیعت کی گئی ہے، اسی تلاش و جستجو کے لیے علامہ فرماتے ہیں،

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو دل خود زندہ دار　　تا نہ گردد مشت خاک تو مزار
ما از تخلیق آرزو زندہ ایم　　از شعاع آرزو تابندہ ایم

علامہ اقبال اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ اپنے اندر مقصد پیدا کرنے کی قوت پیدا کرو، کیونکہ اگر تمہارے اندر مقاصد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو آپ کا دعویٰ اسلام غلط ہے۔ جس کے اندر نصب العین کے حصول کی آرزو نہیں۔ اس میں اور حیوانات میں مطلق فرق نہیں، جس انسان کے اندر دل میں کوئی آرزو نہ ہو وہ زندہ نہیں مردہ ہے۔ جس قوم میں کوئی آرزو نہیں وہ قوم مردہ ہے اگر چہ اس کی تعداد بہت زیادہ کیوں نہ ہو۔ مذکورہ بالا اشعار میں بیان کرتے ہیں کے جس قوم کے اندر کوئی آرزو نہ ہو اس جگہ علامہ اس خفتہ قوم کو بیدار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ قوم مردہ ہے اس لیے اپنے اندر کوئی مقاصد پیدا کرو تا کہ تمہیں کامیاب حاصل ہو جائے۔ انسان کو اللہ رب العزت نے کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے۔ نیچے دیئے گئے شعر میں فرماتے ہیں کہ جس کہ دل میں کوئی آرزو و مقصد نہیں وہ میرے نزدیک مومن نہیں کافر ہے، ملاحظہ ہو۔

ہر کہ او را قوت تخیل نیست　　نزد ما جز کافر و زندیق نیست

علوم و فنون کی تحصیل کا مقصد یہ ہے کہ ان کی بدولت انسان اپنی خودی کی حفاظت و صیافت کا سامان مہیا کر سکے اور اپنی خودی کی استواری کو برقرار رکھ سکے اور اس خودی کے جذبہ سے اس کائنات کو مسخر کر اور اس دنیا کا غلام نہ بن بلکہ بادشاہ کی طرح حکم کر اور عشق و محبت سے اپنے

مالک کا قرب حاصل کر کے اس کا نائب بن جا، اور پھر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

تا کجا بے غیرت دین زیستن ای مسلمان مردن است این زیستن

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جس علم سے کوئی نفع نہ ہو اور جس علم وفن سے کوئی فائدہ نہ ہو وہ علم اور فن دونوں بیکار ہیں۔ علم وفن کا مقصد محض آگاہ وواقفیت نہیں ہے بلکہ علم زندگی کی حفاظت کے لیے ایک آلہ ہے، جس سے انسان اپنی روحانی اور جسمانی دونوں طرح سے حفاظت کر سکتا ہے، اس لیے تو علم سے ایسے کام انجام دینے کی سعی کر یعنی جس سے دنیا فائدہ اٹھائے۔ علم زندگی کا ایک بڑا سرمایہ ہے جس سے انسان اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

آگہی از علم وفن مقصود نیست غنچہ وگل از چمن مقصود نیست

علم از سامان زندگی است علم از اسباب تقویم خودی است

یورپ نے علوم وفنون کو ''اپنی خودی'' کے جوہر کو چمکانے کے لیے بطور صیقل استعمال کیا، اسی علم وفن کی بدولت انہوں نے عناصر اربعہ کو اپنا محکوم بنایا، اس کے بل بوتے پر وہ آج کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے، جس طرح اہل مغرب نے علم کے ذریعے قوت حاصل کر لی ہے اور پوری دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں اور غلام بنا کر رکھا ہے، اہل مشرق کو علم حاصل کرنے کی تاکید کرتے ہیں تا کہ علم کی بدولت وہ عظیم کام انجام دیں جس سے وہ غلامی کی زندگی سے آزاد ہو جائیں۔

قوت افرنگ از علم وفن است از ہمین آتش چراغش روشن است

علامہ اقبال نے پہلے سوچ وفکر میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی کیونکہ جب تک مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا نہیں ہوگا، معاشرتی، سیاسی یا مذہبی انقلاب کبھی پیدا نہیں ہو سکتا اور ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے خواب اور لٹریچر کی جگہ زندگی اور لٹریچر ان کے سامنے پیش کیا، وہ بھی ایسا لٹریچر جو ان کی رگوں کے اندر منجمد خون کو از سر نو گرما دے اور رمز حیات سے آگاہ کر دے۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے خودی کی شرائط پیش کی جن میں پہلی اطاعت دوسری ضبط نفس اور تیسری نیابت الٰہی، ان تمام شرائط میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے بعد اپنے نفس پر قابو پانا اور اسلام پر اپنی جان نثار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا اور آخر میں حق تعالیٰ کا نائب بن جانا کہ جس طرح قرآن میں ذکر آیا ہے۔ جس قوم کے نوجوانوں کے اندر مضبوط اور بلند جذبہ ہو اس قوم کو شمشیر کی ضرورت نہیں

ہوتی کیونکہ وہ اپنے بلند جذبے سے ہی مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

اس قوم کو شمشیر کی ضرورت نہیں رہتی

ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد (ضرب کلیم)

اس نظم میں علامہ اقبالؒ نے اپنی قوم کے ذہن اور عقل میں انقلاب برپا کیا اور یہ بات واضح کر دی کہ جب تک انسان میں خودی زندہ نہیں تب وہ کچھ کام انجام نہیں دے سکتا۔

زبور عجم: علامہ اقبال کی اہم اور شاہکار تصنیف ہے۔ جس کو آپؒ نے تین سال میں پایہ تکمیل کو پہنچایا، علامہ اقبال نے اس قیمتی اور گراں بہا گوہر کی وجہ تسمیہ یوں کی ہے۔ زبور کے اصطلاحی معنی ہیں۔ وہ الہامی کتاب جو حضرت داوٗد پر نازل ہوئی تھی اور عارفانہ یا حکیمانہ کلام کو بھی مجازاً الہام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں علامہ نے اللہ تعالیٰ کی تمحید و تمجید اور حمد و ثنا ہے یہ کتاب آپؒ نے فارسی میں لکھی ہے اس لیے اس کا نام زبور عجم رکھا ہے، یعنی زبور جو عجمی (فارسی) زبان میں ہے اس کتاب کی شروعات میں علامہ اقبالؒ نے پڑھنے والوں ''بخوانندگان کتاب زبور'' کے نام سے نصیحت کی ہے۔ علامہ نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں خدا تعالیٰ سے خطاب کیا ہے، پہلی نظم میں حمد و ثنا اور ٦٦ غزلیات اور دوسرے حصے میں انسان سے خطاب کرتے ہیں اور اس کے بعد قارئین کو اپنی شاعری سے آگاہ کیا ہے۔ زبور عجم کے ساتھ ایک اور کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام ''گلشن راز جدید'' ہے اس کے بعد بندگی نامہ اور چار فصلیں ہیں۔ ان فصلوں میں غلامی کے مفاسد، غلاموں کے فنون لطیفہ، مردان آزاد اور غلاموں کے مذہب کی تصویر پیش کی ہے۔ زبور عجم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

اگر ہو ذوق تو پڑھ خلوت میں زبور عجم فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں (بال جبریل)

ان کی تمام غزلیات نغمات عشق و محبت سے سرشار ہیں اور فلسفہ وحدت الوجود کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب تک انسان کے دل میں سوز و گداز نہ ہو تو انسان عشق حقیقی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا اور وحدت الجود کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے ارباب علم و دانش کو مشورہ دیا کہ اس کو خلوت میں پڑھا جائے کیونکہ اس کتاب میں اسرار حیات پوشیدہ ہیں۔ فلسفہ وحدت الوجود ہی اس کتاب کی روح اور جان ہے۔ اسی کتاب کی پہلی نظم میں علامہ

اقبال بیان کرتے ہیں کے جب تک انسان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو تب تک انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ انسان اپنے آپ میں کمزور ہے اور جب اس کی رحمت شامل حال ہوتی ہے تو برسوں کا کام لمحوں میں انجام کو پہنچتا ہے، اور اس قوم کو حصول مقصد کے لیے کوشاں رہنے کی ترغیب کرتے ہیں۔ اور عشق و محبت اور حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

عشق شورانگیز راہر جادہ درکوے تو برد برتلاش خود چہ می نازد کہ راہ سوی تو برد۔ یعنی عاشق جس طرح بھی کامیابی حاصل کرتا ہے اور حق تعالیٰ کو پالیتا ہے کیونکہ وہ راستہ حق تعالیٰ کی طرف اسے لے جاتا ہے یا حق تعالیٰ خود اسے راہ دکھاتا ہے اور اسی کتاب زبور عجم میں انسان کی تخلیق کا مقصد بیان کرتے ہیں، کہ ہم کیا ہیں اور ہمارے اندر کیا ہے جس سے یہ سوز کار فرما ہے مگر ہم کس سے ملنے کے کار فرما ہیں۔ علامہ نے اس کتاب میں حقیقت عشق و مراتب انسانی اور رحمت خداوندی کا شامل حال ہونا اور دیگر اسرار رموز اخلاقی اور صوفیانہ مسائل کو نہایت ہی مدبرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اے انسان تو اس لیے پیدا کیا ہے کہ تو روحانیت کے درجات کو حاصل کر کے مالک کائنات کا مقرب بن کر اس جہان میں نائب حق کی حیثیت سے زندگی بسر کر اور اس دنیا کا غلام نہ بن کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجھے دنیا پر حکومت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ دنیا تیری خادم ہے اس کو اپنا مقصد نہ بنا بلکہ اس پر اپنی حکومت کر۔

اللہ تعالیٰ نے تجھے اشرف المخلوقات بنایا ہے تیرے اندر وہ کمالات پوشیدہ ہے جن کی وجہ سے یہ کائنات رواں دواں ہوتی ہے، تیرے علاوہ کسی نباتات، حیوانات اور جمادات میں سے کسی کے اندر ایسی قوت نہیں ہے۔ اس لیے تو اس قوت کو بروئے کار لا کر عظیم کام انجام دے سکتا ہے۔ اے انسان صرف تیرے اندر ہی عقل و شعور جیسی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت موجود رکھی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے تیرے اندر سوز دروں یعنی عشق کی دولت عطا کی ہے۔ اس لیے تو اپنی عقل و شعور اور سوز دروں جیسی عظیم نعمتوں کا استعمال کر کیا اس دنیا میں بے مثال اور لافانی کام انجام دے سکتا ہے۔ اس لیے تو وہ کام انجام دے جس سے دنیا مستفید ہو یعنی سائنس، فلسفہ اور فنون کو عام کرتا کہ ساری دنیا بلا امتیاز فائدہ حاصل کرے۔ کیونکہ عقل چراغ کی مانند ہوتی ہے اور راستے میں رکھے ہوئے چراغ سے ہر کوئی مستفید ہوتا ہے۔

جس طرح ان اشعار میں انسان کے مرتبہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ای لالہ صحرائی تنہا نتوانی سوخت — این داغ جگرتابہ برسینہ آدم زن

تو سوز درون اوتو غرمی خون او — باورنکنی چاکے در پیکر عالم زن

عقل است چراغ تو دررہگزرے نہ — عشق ازایاغ تو بابندہ محرم زن

یعنی اس دنیا میں جو کچھ بھی جنبش وحرکت آتی ہے یہ سب تیرے سوز دروں کی وجہ ہےاورایک جگہ انسان اور فرشتہ کے مابین تفاوت کو بیان کرتے ہیں کہ انسان فطرت اور قوانین کا پابند ہے۔یعنی زمان ومکان کی قید میں گرفتار ہےاور فرشتہ ان تمام قیود سے پاک ہےلیکن انسان پھر بھی اس قیدو بند کی زندگی کے باوجود فرشتوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے،آخر انسان میں ایسی کون سی صفت پوشیدہ ہے۔علامہ اقبال اس کی منظرکشی یوں کرتے ہیں

فرشتہ گرچہ بروں ازطلسم افلاک است — نگاہ او بتماشاے این کف خاک است

گمان مبر کہ یک شیوہ عشق می بازند — قبابدوش گل ولالہ ےجنون چاک است

حدیث شوق ادامی توان بخلوت دوست — بنالہ کہ آزلائش نفس پاک است

بنالہ کہ زآلائش نفس پاک است — تو گرفت زچشم ستارہ مردم را

تو گرفت زچشم ستارہ مردم را — خردبدست تو شاہین تندوچالاک است

پیام مشرق: علامہ اقبال نے پیام مشرق مغربی مفکر کی تصنیف ''مغربی دیوان'' کے جواب میں لکھی تھی۔اس کتاب کی تصنیف کا مقصداور مدعاان اخلاقی اور مذہبی حقائق کو پیش کرنا ہے۔جن کا تعلق افراداورقوم کی باطنی تربیت ہے۔اقبالؒ لکھتے ہیں یورپ میں چارسال تک کوئی قوم یاافرادا پنے اندرانقلاب پیدانہیں کرے گا یعنی جب تک اپنے ضمیر کی گہرایوں میں تبدیلی یاانقلاب پیدا نہ کرے اس وقت تک اللہ تعالیٰ بھی اس قوم کی ظاہری حالت میں کوئی تبدیلی یاانقلاب پیدانہیں کرتا۔علامہ پیام مشرق میں ایک نظم جس کاعنوان ''اگرخواہی حیات اندرخطرزی'' ہے جس میں دو ہرنوں کی آپس میں گفتگوکواقبال پیش کرتے ہیں۔ایک ہرن نے دوسرے ہرن سے بیان کیا کہ مجھے کعبۃ اللہ جانا ہے کیونکہ وہاں کوئی شخص کسی کوقتل نہیں کرتا یہاں صحرا میں زندگی دشوار ہے۔ہر وقت شکاری ہماری گھات میں لگے رہتے ہیں۔میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح مجھے اس فتنہ صیاد سے

امان مل سکے۔اس کے ساتھی نے جواب دیا اگر تو دنیا میں زندہ رہنے کا آرزومند ہے تو خطروں میں، مصیبتوں میں اور آفتوں میں زندگی بسر کر کیونکہ زندگی کا لطف مشکلات کا مقابلہ کرنے میں ہے۔مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے سے خودی میں وہی تیزی پیدا ہوتی ہے۔جو تلوار کو سان پر چڑھانے سے اس کی دھار میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔اس طرح جب تک انسان مشکلات کا مقابلہ نہ کرے اس وقت تک اسے عزت وشہرت حاصل نہیں ہوسکتی، اس نظم سے ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

رفیقش گفت ای یارحردمند　　　اگرخواہی حیات اندرخطرزی

دمادم خویشتن رابرفسان زن　　　زتیغ پاک گوہرتیزترزی

وتوان راامتحان است　　　ممکنات جسم وجان است

جوشخص آرام اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا ہے وہ کبھی کسی مہم کو سر نہیں کرسکتا اور نہ میدان جنگ میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے، یعنی جس قوم میں تن پروری اور راحت طلبی پیدا ہوگئی تو وہ قوم مغلوب ہوکر رفتہ رفتہ دنیا سے مٹ گئی۔اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ہر طرز سے کوشاں نظر آتے ہیں اور قوم کو اسلامی زندگی کے ساتھ اس کائنات میں ایک عظیم مفکر اور مصلح کی طرح زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے ہیں اور راحت وعیش طلبی کو ترک کرنے اور اپنے منصب کو پانے کی طرف راغب کرتے ہیں۔علامہ اقبال اس موضوع کی مناسبت سے یوں لکھتے ہیں۔

میارا کہ بزم برساحل کہ آنجا　　　توای زندگانی نرم خیزاست

بہ دریاغلت وباموجش درآویز　　　حیات جاودان اندرستیزاست

علامہ اقبالؒ اسی کتاب میں ایک اور جگہ اہل مغرب پر تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایک نظم ''حکمت فرھنگ'' کے نام سے تحریر کرتے ہیں جس میں اہل مغرب کو ظالم اور سفاک کہتے ہیں کیونکہ وہ اسلحہ اور آلات کو استعمال کر کے نہائت سرعت کے ساتھ عوام کو ہلاک کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ روح قبض کرنے والے فرشتے (عزرائیلؑ) سے بھی تیزی کے ساتھ ہلاک کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ ملک الموت کو عرصہ دراز سے اپنے کام پر فائز ہونے کے باوجود اس کو جان نکالنے میں دیر لگتی ہے یعنی بعض اوقات ایک آدمی کی جان نکالنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔اس لیے کچھ دنوں کے لیے

یورپ بھیج دیا جائے تا کہ وہ اہل یورپ سے سرعت کے ساتھ جان نکالنے کا ہنر سیکھ لے۔

مثنوی پس چہ باید کرد: یہ کتاب بھی علامہ کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے جو ۱۹۳۶ عیسوی میں ان تمام موضوعات کے علاوہ علامہ اقبالؒ دین اور سیاست کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔اس مثنوی سے ایک نظم سے کچھ اشعار جو سیاست اور مذہب کے بارے میں لکھے ہیں ان کا خلاصہ ومفہوم کو مختصراً بیان کرتا ہوں۔علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت جتنی بھی مصاہب دنیا پر رونما ہیں یہ سب اہل یورپ کی ایجاد کردہ ہیں، کیونکہ انہوں نے سیکولرازم کے نام سیامور ریاست میں دین سے لاتعلق ہونے کی ایک سازش قرار دیا ہے یعنی سیاست کو مذہب سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔یہی سیکولرازم انسان کی تمام مشکلات کا سبب بنا۔علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں،

یورپ از شمشیر خود بسمل افتاد　　زیر گردوں رسم لا دینی نہاد

اس کے بعد علامہؒ ''احوال حبش'' سے عبرت حاصل کرنے اور رنگ ونسل کے امتیازات سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اہل حق را زندگی از قوت است　　قوت ہر ملت از جمعیت است

اسی نظم میں علامہ احساس کمتری کو دل سے نکالنے کی تاکید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں اور ایشیا یعنی مشرق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ قدیم زمانے سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اور اس کی تعریف کرتے ہیں کہ مشرق کی سرزمین مغرب کی سرزمین سے کئی درجہ بہتر ہے نمونے کے طور پر دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

سوز وساز درد وداغ از آسیا است　　ہم شراب وہم ایاغ از آسیا است

عشق را مادلبری آموختیم　　شیوہ آدم گری آموختیم

ہم ہنر ہم دیں زخاک خاور است　　رشک گردون خاک پاک خاور است

اس طرح علامہؒ نے اپنی تصنیف میں سیاست، مذہب، سماج اور دیگر پند ونصائح کی ہیں کہ اہل یورپ کو پیغام حق سناو اور یورپ کی کسی سیاسی جماعت پر اعتماد مت کرو، رنگ ونسل کے امتیازات ختم کرو اور جمعیت اقوام مشرق قائم کرو۔

جاوید نامہ: جاوید نامہ علامہ اقبالؒ کی فارسی شاعری کی وہ کتاب ہے جو انھوں نے مثنوی کی شکل میں لکھی جس میں تقریباً ۲۰۰۰ اشعار ہیں، ۱۹۳۲ عیسوی میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب علامہ کا خیالی سفر نامہ ہے، جس میں ان کے روحانی پیر و مرشد مولانا جلال الدین رومیؒ انھیں مختلف سیاروں کی سیر کرواتے ہیں۔ جہاں علامہ اقبالؒ تاریخ کی کئی نامور ہستیوں کی ارواح سے ملاقات کرتے ہیں اور اس مثنوی میں قسم قسم کے علمی و فکری، دینی و سیاسی اور اجتماعی حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ کے بارے میں لکھا۔

آنچہ گفتم از جھانے دیگر است این کتاب از آسمانے دیگر است

اس کتاب میں ایک تخیلاتی سفر کا جو مولانا روم کی روح اور شاعر کی روح کا سفر ہے اور اس روحانی سفر کے واقعات کا ذکر کیا ہے جس وقت علامہ اقبال مولانا روم کی مثنوی کا مطالعہ کر رہے تھے تو ان پر کیفیت طاری ہوئی جس میں مولانا روم کی روح حاضر ہوئی اس طرح مولانا رومؒ کی روح نے علامہ کی روح کی رہبری کرتے ہوئے سات ستاروں (سات فلک) اور جنت کی سیر کرائی۔ اور آخر میں خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں جہاں مولانا کی روح انہیں تنہا چھوڑ دیتی ہے کہ خدا کے حضور میں تنہا پیش ہونا، یہاں شاعر خدا کی صفات و جمال سے بعض سوالات پوچھتا ہے۔ اس کتاب میں اپنے بیٹے جاوید کو مخاطب کر کے قوم کو خطاب کرتے ہیں۔ یہ کتاب علامہ اقبالؒ مغربی مفکر ڈانٹے کی کتاب ''ڈیوائن کامیڈی'' کی طرز پر لکھی ہے جو معراج نبیؐ کے موضوع پر تھی۔ اس کتاب کی تحریر کا زمانہ نہائت ہی ظلم و استبداد کا زمانہ تھا جب عوام پہلی عظیم جنگ میں ایل یورپ کے ہاتھوں قتل ہو رہی تھی۔ مذہب اور اخلاق کو در گور کر کے ان کی جگہ یورپی سیاست یعنی اسلام مخالف سیاست ان کی جگہ لے رہی تھی اور ملک کا سیاسی نظام غیر منظّم ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں بھی ہندو مسلم فسادات رونما ہو رہے تھے۔ اس وقت علامہ اقبالؒ ملک کے پریشان کن حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور انسان کو اس کے حقیقی مقاصد اور مقام سے آشنا کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ہندوستانی قوم جو انگریزوں کی غلام بنی ہوئی تھی تو ان کو یہ درس دیا کہ اگر تم آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے مقام سے آگاہ ہو کر عقل کی بجائے عشق کی پیروی کرو تا کہ فلاح حاصل کر سکو۔

جاوید نامہ کے آخر میں ایک نظم جس کا عنوان ''سخنے بنژادنو'' ہے جس میں علامہ نے

اپنے بیٹے جاوید اقبال کو مخاطب کر کے نو جوانوں کو پیغام دیا ہے، لکھتے ہیں۔

ای آدمیت احترام آدمی — باخبر شو از مقام آدمی
آدمی از ربط و ضبط تن — بر طریق دوستی گامے بزن
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق — می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل — دل اگر بگریز داز دل، وای دل
گر چہ دل زندانی آب و گل است — این ھمہ آفاق آفاق دل است

ایک دوسری جگہ علامہ نو جوانوں سے مخاطب ہیں کہ اس جہان میں اپنے دل میں درد کے سوا کچھ خواہش نہ کر کیونکہ یہ درد ایک عشق ہے جس کی بدولت انسان ترقی کرتا ہے اور اس جہان میں سوز دروں کے ذریعے اس کائنات میں حکمرانی کر سکتا ہے اور اپنے مالک حقیقی کے علاوہ کسی کے آگے اپنی جھولی مت پھیلا، اخلاص کا شیوہ قائم رکھ اور دنیا دار بادشاہوں اور امیروں سے اپنے آپ کو دور رکھ اور ایک دوسرے کے ساتھ اخوت و محبت کا طریقہ اختیار کرتا کہ یکجہتی سے ترقی پا سکے، کافر و مومن سب خدا کی مخلوق ہیں، اپنے شعر میں یوں لکھتے ہیں،

در جھان خبر جز درد دل سامان مخواہ — نعمت از حق خواہ واز سلطان مخواہ
منکر حق نز د ملا کافر است — منکر خود نز د من کافر است
شیوہ اخلاص را محکم بگیر — پاک شو از خوف سلطان و امیر
زندگی جز لذت پرواز نیست — آشیاں با فطرت او ساز نیست
حرف بد برلب آوردن خطا است — کافر و مومن ہمہ خلق خدا است

رموز بیخودی: یہ مثنوی ۱۹۱۸عیسوی میں شائع ہوئی، اس مثنوی میں علامہؒ نے اسلام کے دستور العمل کی وضاحت کی، اس میں اسلام کے بنیادی افکار، اصول اور ارکان وضاحت سے بیان کیے ہیں اسلامی طرز کے اپنانے کو ضابطہ حیات قرار دیا ہے۔ یہ کتاب بھی علامہ نے فلسفہ خودی پر تحریر کی ہے۔نمونے کے طور پر چند مصرعے جو علامہ اقبالؒ نے دین اسلام کے آئین اور شریعت کی اتباع کے ضمن میں تحریر کیے ہیں کہ انسان کے خوبصورت کردار دین اسلام کی اتباع پر موقوف ہیں

ہست دین مصطفٰے دین حیات — شرع او تفسیر آئین حیات

گر زمینی آسمان سازد ترا　　آنچہ حق می خواند آں سازد ترا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را　　از دل آہن رباید زنگ را

اس کے بعد علامہ مسلمان عورتوں سے خطاب کرتے ہیں اور اسوہ فاطمہ پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور خطاب کرتے ہیں کہ تیری چادر قوم کی عزت کی محافظ ہےیعنی ایک پاک سیرت عورت اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر کے اشرف المخلوقات ہونے کے دعوے کو حقیقت ثابت کرتی ہے جس سے دین کو استحکام ملتا ہے، کیونکہ تیری پاکیزہ گود سے دین اسلام کے محافظ پیدا ہوتے ہیں، اس طرح علامہ نے مسلمان عورتوں کو اسلام کی محافظ، اور اسلام کی محبت کا آئین قرار دیا ہے

اے روایت پردہ ناموس ما　　تاب تو سرمایہ فانوس ما

طینت پاک تو ما را رحمت است　　قوت دین و اساس ملت است

کودک ما چوں لب از شیر تو شست　　لا الہ آموختی او را نخست

ہوشیار از دستبرد روزگار　　گیر فرزندان خود در کنار

ایں چمن زاداں کہ پر نکشادہ اندز　　آشیان خویشتن دور افتادہ است

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند　　چشم ہوش از اسوہ زہرا مبند

تا حسینے شاخ تو بار آورد　　موسم پیشیں بگلزار آورد

ارمغان حجاز: علامہ کی یہ کتاب اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے۔جس میں علامہ نے مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔اختصار کے لیے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

علامہ اقبال بارگاہ حضور سرور کائنات میں اس طرح لکھتے ہیں کہ جو میرے اندر سوز و گداز، تب و تاب اور یہ حرکت سب آپ محبت اور جدائی کے غم سے ہند کی سرزمین پر دیوانہ وار روتا ہے، یہاں اس موضوع کی مناسبت سے علامہؒ کی ایک رباعی پیش کرتا ہوں۔

تب و تاب دل من از سوز غم تست　　نوائے من ز تاثیر دم تست

بنالم زانکہ اندر کشور ہند　　ندیدم بندہ کو محرم تست

مسلمانوں کے مرتبہ و مقام کو اس طرح بیان کرتے ہیں

مسلمان گرچہ بے خیل و سپاہے است　　ضمیر او ضمیر پادشاہے است

اگراورامقامش بازبخشد　　　　جمال اوجلال بے پناہےاست

اسطرح علامہ اقبال نے اپنی تصانیف میں مختلف موضوعات اور مسائل پیش کیے ہیں جن میں فلسفہ خودی کو دوام بخشا ہے ان کے کلام میں عشق حقیقی موجزن ہے، سیاست، جہاد، سماجی بیداری، ملکی اقتصادیات، نوجوانوں میں خوداعتمادی، انسانیت اوراخوت اور خاص کرمسلمانوں کوترقی کی راہ پرگامزن کرنے کے لیےکوشاں دکھائی دیتے ہیں۔اور جابجامختلف اور نئےعنوانات کے ساتھ قوم وملت،نوجوانوں اورعورتوں کوخطاب کیا ہے تاکہ وہ اسلامی زندگی گزارتے ہوئے اس جہان میں حکومت کریں اورعورتوں سے خطاب کرتے ہیں کہ تم اسلام کی آبروہواس لیے بچوں کی تربیت اسلامی طرز پرکرنی چاہے۔علامہ اقبالؒ نے اپنے اشعارکوذریعہ بلاغت بنا کرقوم کو بیدار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔اقبالؒ ایک انقلابی شاعر تھے جنھوں نے اپنی خفتہ اورمردہ دل قوم کے اندرتحریک پیدا کرکے انہیں اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔

☆☆☆

کتابیات:

ا۔مثنوی پس چہ باید کرد،محمداقبال،شارح یوسف سلیم اعتقاد پبلشنگ ہاوس۱۶۵۱کوتانہ اسٹریٹ سوئیولان،نئی دہلی

۲۔پیام مشرق،محمداقبال،شارح یوسف سلیم،اعتقاد پبلشنگ ہاوس۱۶۵۱کوتانہ اسٹریٹ سوئیولان،نئی دہلی۳۔

اسرارخودی،محمداقبال،شارح یوسف سلیم،اقبال اکیڈمی ظفرمنزل،تاج پورہ لاہور

۴۔رموزبیخودی،محمداقبال،شارح یوسف سلیم،اعتقاد پبلشنگ ہاوس۱۹۱۴گلی کوتانہ سوئیولان دہلی

۵۔زبورعجم،محمداقبال،شارح یوسف سلیم،اعتقاد پبلشنگ ہاوس۱۵۶۱کوتانہ اسٹریٹ سوئیولان،نئی دہلی

۶۔جاویدنامہ،محمداقبال،شارح یوسف سلیم،عشرت پبلشنگ ہاوس،ہسپتال روڈ،انارکلی،لاہور

۷۔ارمغان حجاز،محمداقبال،عشرت پبلشنگ ہاوس،،ہسپتال روڈ،انارکلی،لاہور

۸۔سیرت اقبال،محمدطاہرفاروقی،اریب پبلیکیشنز،۱۵۴۲،پٹودی ہاوس،دریا گنج،نئی دہلی،۲۰۲۱

۹۔اقبال شخصیت۔افکاروتصورات،مطالعہ کانیا تناظر،سلیم اختر،۱۵۴۲،پٹودی ہاوس،دریا گنج،نئی دہلی،۲۰۲۱

۱۰۔اقبال مسلم فکرکاارتقا(فلسفہ)،عطیہ سید،۲۴۵۱پٹودی ہاوس،دریا گنج،نئی دہلی۔

۱۱۔زندہ رود، جاوید اقبال (علامہ اقبال کی مکمل کی سوانح حیات)، علمی اکیڈمی ۱۴۲۲، کوچہ چیلاں نئی دہلی
۱۲۔اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹
۱۳۔اقبال کا نظریہ خودی، عبدالغنی، مکتبہ جامع لمیٹیڈ، جامع نگر نئی دہلی، ۲۰۰۱۱
۱۴۔اقبال کا فن، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶
۱۵۔شذرات فکر اقبال، جاوید اقبال، مترجم افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور۔
۱۶۔اقبال شناسی، منظور احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ، لاہور۔
۱۷۔تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۱۴ میکلورڈ روڈ لاہور، ۱۹۸۲
۱۸۔خطبات اقبال۔ایک جائزہ، محمد شریف بقا، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۱۴ میکلورڈ روڈ لاہور
۱۹۔خطبات اقبال پر ایک نظر، سعید احمد اکبر آبادی، اقبال انسٹی ٹیوت کشمیر یونیورسٹی، سرینگر۔
۲۰۔روح اسلام۔اقبال کی نظر میں، محمد ولی الدین، نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد۔۳ ۱۹۷
۲۱۔دانش، شمارہ سی و ہفتم ۲۰۱۹ میلادی، گروہ فارسی دانشکدہ ادبیات وعلوم انسانی دانش گاہ کشمیر
۲۲۔دانش،، شمارہ سی و چہارم ۲۰۱۷ میلادی، گروہ فارسی دانشکدہ ادبیات وعلوم انسانی دانش گاہ کشمیر

ولی دکنی کی شاعری میں تصور عشق

ڈاکٹر سیف الدین احمد
شعبہ تاریخ، فیکلٹی آف سوشل سائنس
یونیورسٹی آف دہلی، نئی دہلی

Abstract:

Muhammad Wali Dakani was poet par excellence and a great literary figure whose historical role is unquestionable towards popularization of Urdu literature in North India. He laid the foundation for the ascendancy of Urdu in North India by showing the possibility of Hindavi (mother tongue) as a feasible medium for poetry, especially of the ghazal variety. Wali is regarded as the Adam of Urdu (*Baba-i Rekhta* or *Adam-i Urdu*) poetry and enjoys the same status as that of Chaucer (1343-1400 CE) in English poetry and Rudaki (858-941 CE) in Persian. Wali's most important contribution was to infuse a sense of a new poetics modeled on the Indian style of Persian poetry. Rekhta/Hindi in Delhi acquired a literary status and sophistication under the influence of Wali.

The arrival of Wali's diwan in 1720 CE (2nd regnal year of Muhammad Shah) led to the beginning of a new philosophy of poetry and its compositions provided a jumpstart to Rekhta/Hindi

poetry in Delhi. Persian gradually lost its hold on the masses as well as the elite. This paper briefly explores the historical role of Wali, his linguistic and poetic art especially his ghazals and influence on the development of Urdu language.

The poetry of Wali is important in the sense that it has the prevue of the classical style of poetry which incorporates the sweetness and cache of vocabulary. There are plenty of his verses explicating diverse facets of human experiences of life such as his romantic verses (Ishqiah sha'yri). His poetry has an exclusive style of its own which embodies mastery in compositions, Sufistic piousness, lucidity of Hindi and the firmness and sweetness of Persian language. Ghazal is essentially a means to converse with women; hence the excellence lies in its simple style, tenderness, sweetness and passion. The marvel of his philosophical thought is its simplicity and tenderness. When this simplicity accomplishes brilliance, On the one hand, it attains profundity from the view point of effects and value and on the other it blends with the tongue of common conversation. Wali accomplished this fiat and candor continued to be firmly grounded even in complicated rhymes, which is the rudimentary characteristic of his poetry.

☆☆☆

اردو زبان اگر چہ شمال ہند میں دہلی اور مضافات دہلی کی شہری، بازاری اور لشکری زبانوں کے لسانیاتی اثرات سے گھل مل کر ایک ہیولیٰ بنی۔ لیکن اس کی شاعری نے جنوبی ہند میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور دکن کے ہندوستانی باشندوں کے ہاتھوں کے سہارے گھٹنوں چلنا سیکھا۔ اردو کے یہ دکنی

سرپرست بھی دکن کے اصلی باشندے نہیں تھے۔ بلکہ یہ وہ تھے جو دہلی اور نواح دہلی کے علاوہ پورے ہندوستان سے آکر دکن کے مختلف تمدنی گوشوں میں آباد ہوئے تھے۔ ان کا پہلا گروہ اس وقت دکن پہنچا جب کہ محمد تغلق اپنا دارالسلطنت دہلی سے دکن (1326 A.D.) کے علاقے دیوگری میں منتقل کیا، اور دہلی کی پوری آبادی کو دہلی سے منتقل ہونے کا حکم دیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ہی اس کو دوبارہ دہلی کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کیا ان میں جو صاحب استطاعت تھے وہ تو بہ سہولت دہلی لوٹ آئے لیکن مفلوک الحال طبقہ اپنی بدحالی کی بنا پر وطن کی طرف نہ لوٹ سکا اور دکن ہی میں بود و باش اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔[1] اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد شمالی ہند والوں کا ایک گروہ جنوبی ہند میں حسن گنگو بانی سلطنت دکن کے ساتھ ادھر آیا حسن گنگو کے لشکر کے سپاہی، دوکان دار اور اہل حرفہ کچھ دہلی اور نواح دہلی کے کچھ پوربی ہندوستان کے باشندے تھے جو وہی زبان بولتے ہوئے آئے جس کا نام اس وقت اردو نہیں ''پوربی'' یا ہندی'' تھا۔ ان کی زبانوں پر وہی دیہاتی اور بازاری گیت تھے جو خالص عوامی جذبات کی آواز تھے۔ عوامی جذبات کی یہی آوازیں اردو شاعری کا ابتدائی ڈھانچہ بنیں اور بنتی رہیں۔

دکن کے بادشاہ امراء اپنے عوام سے اتنے دور نہ تھے جتنے دہلی کے سلاطین ہوا کرتے تھے۔ اس لیے جب انہیں بھی شاعری کا شوق ہوا تو انہوں نے اپنے ذوق شعر گوئی کو عوامی گیت کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ فارسی اگر چہ اس عہد میں بھی دربار اور محل سراؤں میں بولی جانے کے علاوہ علمی و ادبی اور سیاسی زبان تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کیوں فارسی شاعری سے کسبِ ذوق نہیں کیا۔ اور اپنے جذبات کی ترجمانی انہیں گیتوں کے اسالیب میں کرنے لگے جو ان کے لشکروں کی زبان پر تھے۔

بہر حال سبب جو کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ دکن کی ابتدائی اردو شاعری میں شمالی ہندوستان کی مقامی بھاشاؤں کے عوامی گیتوں کی گونج ہر جگہ پائی جاتی ہے۔[2] وہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد سے زیادہ کرشن رادھا سے واقف اور مانوس تھے۔ دکن کی عاشقانہ شاعری میں اظہار جذبات عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور ان کے شعروں میں وہی جذبات ہوتے تھے جو گوپیوں کے دل میں اپنے محبوب کرشن کنہیا کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اردو کی دکنی شاعری کا یہ رنگ و آہنگ اس وقت تک رہا جب تک کہ ولی نے اسے فارسی تغزل سے روشناس نہ کرادیا۔ اس روشناسی نے

ایک نیا قالب اور اس کی ارتقائی رفتار کو ایک نئی سمت بتلائی۔[۳]

دکنی غزل نے اپنی ترتیب فارسی غزل سے لی، لیکن اس کی بنیاد پوری طرح ہندوی روایت پر رکھی گئی۔ دکنی غزل کی اس عوامی روپ کی جھلکیاں محمد قلی قطب شاہ اور اس کے ہم عصر شعراء کی غزلوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح دکنی غزل میں زبان و کلچر کے ہندوی دھارے میں فارسی اثرات اسی طرح مدغم ہونے لگے کہ ماہرین لسانیات اندازہ ہی لگاتے رہے کہ کون سی زبان نے کس زبان کو اپنایا ہے۔[۴] بہرحال اسے ہم ہند ایرانی روایت کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ اور لسانی امتزاج کا یہ عمل فطری تھا۔ اس طرح غزل اس سنگم کا آئینہ دار ہوگئی۔

جنوبی ہند کے حکمراں اور رعایا اس سرزمین سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ اس لیے دکنی غزل کی جڑیں اس سرزمین کی تہذیبی زندگی میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دکنی شعراء نے اپنے ماحول اور اپنے مخصوص تمدن میں غزل کے فنی خدوخال ابھارے اور اسے ایک منفرد آہنگ اور ایک نئے مزاج سے آشنا کیا۔ دکن میں غزل گوئی کا تجربہ خاصا کامیاب رہا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض فارسی اور ہندی آمیزش کو زیادہ مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا چوں کہ کبھی کبھی یہ آمیزش کسی صنف کی اصلی خوبی کے معارض ثابت ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ وزیر آغا کا کہنا ہے ''دکنی دور کی اردو غزل کو نہ تو گیت کا درجہ دیا جاسکتا ہے کہ اس میں گیت کے قدرتی لوچ، غنائیت اور خود روانی کا فقدان ہے اور نہ اسے غزل کے مزاج ہی کا علمبردار قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس میں غزل کی روانی اور آوارہ خرامی کا رجحان باقی نہیں رہا''[۵]

شاعری کی بنیاد تعمیر کرنے کی ابتداء ولی سے ہوئی، اپنے ہندوستانی عناصر کی بدولت دکنی غزل ایک علیٰحدہ روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہندوستانی تصورات، ماحول، معاشرت کی عکاسی، دکنی غزل کے مزاج اور طرز فکر میں رچے بسے ہوئے ہیں اور انہیں اسباب کی وجہ سے وہاں کی عشقیہ شاعری دوسرے دور کی عشقیہ شاعری سے مختلف ہے۔ یہاں واردات عشق، معاملات عشق اور تصورات عشق سرے سے جداگانہ ہیں۔ دکنی غزلوں میں معشوق و محبوب کا وہ تصور نہیں جو عام غزلوں کا ہے بلکہ گیتوں سے متاثر ہونے کے سبب یہاں اظہار عشق صنف نازک یعنی عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے نصیر الدین ہاشمی کو اس بات پر شک ہوگیا اور اس بات کے قائل ہوگئے کہ ریختی کی ایجاد لکھنؤ سے قبل

دکن میں ہو چکی تھی جیسے کہ اشعار دیکھیے۔

کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی الجھو پیتی ہوں میں
تج نے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا

☆

چندر بدن کہا تو کہیں موں سنبھال بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول

(نصرتی)

ابتدائی دور کے دکنی شعراء کی غزلوں کا اگر بغور جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ محبوب اپنی صحیح جنس، اپنے حقیقی خدوخال اور اصلی روپ میں ہر جگہ جلوہ گر نظر آتا ہے یوں تو اس دور میں بھی فارسی غزل کے اثرات پائے جاتے ہیں لیکن دکنی شعراء کا محبوب مرد کے بجائے اپنی ارضی محبوب سے ہم کلام ہے۔ان کے کلام میں محبوب جسم و جان کا ایک زندہ اور ارضی مادی پیکر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ارضی محبت کا نشہ دکنی شعراء کے اشعار میں جاری و ساری دکھائی دیتا ہے۔دکنی شاعر نے محبوب کے لیے اکثر جگہ تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے اور یہ خصوصیت بعد کے دور کے شعراء میں ناپید ہوگئی۔دکن کے غزل گو شعراء کے یہاں حسن اپنی جلوہ سامانیوں، اپنی کشش اور جاذبیت کے ساتھ ساتھ اپنی حقیقی جنس میں بھی نمودار ہوتا ہے۔دکنی شاعر محبوب کو گوری سہیلی، گن بھری، سکی، نار، سودھن، موہن، سندری اور پیاری جیسے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔جیسے کے قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں مشہور ہیں۔حسن شوقی، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، نصرتی، بحری، غواصی اور ملک خشنود کے کلام سے چند مثالیں پیش ہیں:

جانا تجے جو دیکھت جگ بھری کتے ہیں
کوئی حور پدمنی کوئی، کوئی شہ پری کتے ہیں

(حسن شوقی)

چھیلی سوں لگیا ہے من ہمارا
کہ اس بن نہیں ہمیں یکتل قرار

(محمد قلی قطب شاہ)

اس لیے سیدہ جعفر دکنی غزل کو شعراء کے محبوب کے سلسلے میں کہتی ہیں کہ دکنی غزل گو شعراء کا محبوب اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے دوسرے غزل گو شعراء کے محبوب سے منفرد ہے۔[۶] دراصل دکنی شعراء صرف محبوب کے لب ورخسار اور زلف وابر کی دلکشی کی ہی تعریف نہیں کرتے بلکہ وہ بڑے بے باکی اور صداقت پسندی کے ساتھ حسن کی ان تمام رعنائیوں کی مصوری کرتے ہیں جو انہیں مسحور کر دیتی ہیں۔اس طرز اظہار نے دکنی شعراء کی غزلوں میں عریانی اور بے باکی کا عنصر شامل کر دیا۔

دکنی شعراء نے محبوب مجازی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے خوبصورت تشبیہات ومعنیٰ خیز استعارات سے کام لے کر اپنی تصویروں کو نظر فریب بنا دیا ہے۔محمد قلی قطب شاہ، شاہی عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور ولی کے کلام میں ایسی مسلسل غزلیں موجود ہیں جن میں ایک مخصوص تصویر کی زیریں لہریں پوری غزل میں دوڑتی نظر آتی ہیں۔اس لیے دکنی غزلوں کے محبوباؤں کے ان مرقعوں کو دیکھ کر بہت سے ناقدین یہ کہتے ہیں کہ ایلورا، اجنتا اور کھجوراہو کے وہ خوبصورت مجسمے ہیں جن کی اخلاقی حیثیت سے بحث کی جاسکتی ہے۔

دکنی شعراء کے کلام میں مادی حسن اپنے اصلی اور حقیقی روپ میں جلوہ گر نظر آتا ہے، ان شعراء نے صنف غزل میں سراپا گوئی کے لوازم کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسن کی تعریف وتوصیف کو ایک نئی معنویت اور حقیقت پسندی عطا کی، ان شعراء کے جمالیاتی ذوق اور رومانی شعور نے حسن کی ایسی لازوال تصویر پیش کی ہے جو آج بھی دھندلی نہیں ہوئی ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ دکنی غزل گو شعراء صرف عشق مجازی کے پروردہ اور حسن کے گرویدہ تھے، بلکہ ان کے یہاں عشق حقیقی کے وجدان وتصور کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ان کے شعری افکار اور وجدانی تجربات میں ارضی مزاج اور تہذیبی روایات کی پاسداری کے علاوہ ان کے ذہن میں تصوف اور بھگتی کا بھی اثر محسوس ہوتا ہے جیسے کہ قلی قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی، نصرتی، لطفی ملک خوشنود اور بعض دوسرے شعراء بھی اپنی غزل میں ان مابعد الطبیعاتی تصورات سے کم ہی صحیح سروکار ضرور رکھتے ہیں۔لیکن از روئے فکر وفن دیکھا جائے تو ان شعراء کی شاعری کا اصلی جوہر وہاں نکھر کر سامنے آتا ہے جہاں انہوں نے محبوب کے مادی حسن اور اس کی رنگا رنگ جلوؤں کی عکاسی کی ہے۔

دکنی عشقیہ شاعری کا ایک روپ وہ بھی ہے جس میں روح برہمن اور محبوب خدا ہے آتما

برہم میں لین ہونے کے لیے بیتاب ہے۔اس قسم کے رنگ کو سُگن اور نرگن سالکین نے بڑا فروغ دیا ہے کہ کرشن بھگتی ''سکھی بھاؤ'' بھی اس روایت کی توسیع ہے۔دوسرے لفظوں میں دکنی غزل کے نسائی آہنگ میں ایک نغمہ تصوف کا بھی ہے۔جس میں جزو کل سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے دکنی غزل کے اس رنگ میں جنسی شاعری کے برعکس بڑی پاکیزہ اور مقدس فضا ہے۔بہمنی دور کے شاعر لطفی کا یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

خلوت سے سجن کے میں موم کی بتی ہوں یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت پتی ہوں
لطفی ترے جلن کی پا کی کہاں ہے اس میں جیوں پانچ پانڈواں تے کہتے سودھر پتی ہوں

ولی جدید اردو کے صاحب طرز سخن ور تھے۔ بیجا پور اور گولکنڈہ کی دکنی سلطنتیں ان کی آنکھوں کے سامنے نیست و نابود ہو چکی تھیں۔دکن کی سیاسی انتشار اور افراتفری نے انہیں پریشان حال بنا رکھا تھا۔وہ کبھی احمد آباد پہنچے تو کبھی شاہ جہاں آباد کی گلیوں اور خانقاہوں میں نظر آنے لگے ان کی انہیں سیّاحی صلاحیت کی بدولت دکنی زبان و شاعری جگہ جگہ روشناس ہوئی۔ نتیجے میں حاتم، آبرو اور دہلی کے دور اول کے شعراء نے فارسی گوئی ترک کر کے اردو میں لکھنا شروع کیا۔اس دور کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا ولی کے دہلی آمد نے دوسرے نظریہ سے دیکھتے ہیں اور اس رنگ سخن میں شاعری کرنے کو ولی کی طبیعت کی بے قراری کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔

جب ولی نے غزل گوئی کی ابتداء کی اس وقت دکنی غزل کا تصور صرف یہ تھا کہ غزل عورتوں سے بات کرنے یا حسن و جمال ناز اور اقرار و انکار کے عام سطحی اور خارجی موضوعات ہی شامل ہوتے تھے۔شاہی سے لے کر غواصی تک کے بیان میں خارجی تصور کارفرما نظر آتے ہیں۔سوائے کچھ شعراء محمود حسن شوقی وغیرہ کے یہاں تھوڑی سی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے کہ ولی اسی روایت کو بہت ہی مستحکم طریقے سے آگے بڑھاتے ہیں۔اس لیے جمیل جالبی کہتے ہیں کہ ولی نے اس سطح پر دو امور انجام دیا ہے:

''ولی نے شمال اور جنوب کی زبان کو ملا کر ایک ایسا
ادبی روپ دیا جو بیک وقت دونوں کے لیے قابل
قبول تھا۔اظہار کے اس روپ نے اردو کو فارسی

کی جگہ بٹھا دیا۔ یہ اس وقت سارے معاشرے کی
شدید خواہش اور ضرورت تھی۔''

''ولی کی عظمت کا راز یہ نہیں کہ انہوں نے فارسی
کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا بلکہ ان کا کارنامہ
ہے۔ کہ انہوں نے ایک ایسا رنگ شاعری ایجاد
کیا جس میں ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ فضا
کی خوشبو بھی موجود ہے جس میں حقائق و معرفت
کے مضامین، روحانیت تصوف اور خیالات و
جذبات کا علو ہے تو دوسری طرف اس کا رشتہ اس
زمین سے بھی جڑا ہوا ہے۔'' ۷

ولی بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ ان کی پوری شاعری پر حسن و عشق کا جلوہ کارفرما نظر آتا ہے محبوب کی اداؤں کی عکاسی اور کیفیتوں کی ترجمانی ان کا خاص میدان ہے۔ یہاں عشق اور سوز عشق کا بیان بہت سادہ اور سرل انداز میں ہوتا ہے جو اردو شاعری میں ایک نئی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور دوسری ایک انسان کے دلوں کی دھڑکن اس میں شامل ہے۔

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ
جلوہ گر جب سو وو جمال ہوا نور، خورشید پائمال ہوا
عشق کے راہ کے مسافر کو ہر قدم تجھ گلی تین منزل ہے
اے نور جہاں و دیدۂ ترا انتظار میں
مدت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں ۸

عشقیہ شاعری کی اہم خوبی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں سوز و درد کا احساس پیدا ہوا اور ناقدین کا خیال ہے کہ سوز و درد کی کیفیت سے سرور خوشی کی کیفیت میں زیادہ تہہ داری اور معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔ جیسے سید مسعود حسین رضوی فرماتے ہیں:

''اب رہا غم تو وہ شاعری کے لیے خوشی سے کہیں بہتر

ہے،خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی
ہےاورغم بلندترین حسیات کو پیدا کرتا ہے۔''۹

ولی کے سوز و درد کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔

عشق کے ہاتھ سے ہوئے دل ریش جگ میں کیا بادشاہ ، کیا درویش
جسے عشق کا تیر کاری لگے اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے ۱۰
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
نہ ڈھونڈ وشہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانہ تم کہ ہے عشاق کا مسکن کبھو صحرا کبھو پربت

غرض کہ عشق کی مختلف کیفیات ،محبت وفاداری کے رشتے اور راز عشق کا بیان ولی کی غزل میں بھرپور انداز میں ملتا ہے اور ایسے امکانات کو بروئے کار لایا ہے جن سے اردو شاعری کے سامنے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔

ولی کے تصور عشق میں وفاداری بشرط استواری کا عقیدہ بہت اہمیت رکھتا ہے یہاں عاشق نہ بوالہوس ہے کہ حسن پرستی شعار کرے اور نہ ہرجائی ہے کہ در در جھانکتا پھرے،اس وفاداری کے سبب اس کے یہاں جلنے تڑپنے اور اندر ہی اندر عشق کی آگ میں سلگنے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ شاہی اور نصرتی کی طرح اپنے شکار سے کھیلتا نظر نہیں آتا بلکہ معشوق کی ہر ہر ادا اور اس کے خدوخال سے گرمی عشق کو تیز کر کے اپنی کیفیت جذبے اور سوز کو گہرا کرتا ہے۔

آنکھیں ہیں یہ خوباں جہاں کی کہ لگی ہیں
بوٹی نہیں نرگس کی صنم تیری قبا پر

☆

صنعت کے مصور نے صباحت کے صفحے پر
تصویر بنائی ہے ترے نور کو مل کر

ولی کے یہاں عشق میں ایک شائستگی ہے،سنجیدگی اور گہرائی ہے،ضبط و ٹھہراؤ ہے یہاں تصور عشق پہلی بار علوی سطح پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ولی کی تخلیقات میں عاشق کا کردار بھی اس کے تصور عشق کا ایک پہلو ہے۔عاشق اپنے عشق میں نہایت مخلص اور ثابت قدم ہے اس کے سامنے

''وفاداری شرط استواری'' کا عقیدہ بہت اہمیت رکھتا ہے اسی وفاداری کے سبب اس کے یہاں جلنے تڑپنے اور اندر ہی اندر سلگنے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کو قدم قدم پر نا کامیوں سے کام پڑتا ہے مگر مایوس نہیں ہوتا۔ اضطراب مسلسل کی وجہ سے سرگرداں ضرور ہے مگر دشت نوردی پر سعی مسلسل کا ایک نمونہ ہے جس سے سلیقہ محبت کا ایک مہذب انداز ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے خوخال
حوضِ کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال[11]

☆

نہ جانوں خط تیرا کس بے خطا پر
جلا ہے آج فوجِ شام لے کر

☆

اسے ولی آب اس پری رو کی
مجھ سنے کا غبار کھوتی ہے

عشق کا فلسفہ یا تصور اردو شاعری میں کسی ایک مکتب فکر کی پیداوار نہیں بلکہ یہ تو ہند ایرانی تصورات کا سنگم ہے، نیز اس کلیہ کی بھی صراحت ہوئی ہے۔ کہ عشق حقیقی کے لیے عشق مجازی ایک زینہ کا کام کرتا ہے جو حقیقتاً سالک اور بھگتوں کی پہلی منزل اور پہلا پڑاؤ ہوتا ہے۔ اس لیے ولی کہتا ہے۔

در وادی حقیقت جن نے قدم رکھا ہے
اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا [12]

اس کے بعد وہ عشق کے سوتے کو عشق حقیقی سے ملاتے نظر آتے ہیں۔

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فن عاشقی عجب فن ہے

عشق کا یہ ماورائی یا مابعد الطبیعاتی تصور صوفیا سے منسلک ہے۔ عشق کی وہ اعلیٰ سطح جس کو

گوپی چند نارنگ نے عشقیہ شاعری کی اعلیٰ کیفیت سے تعبیر کیا ہے اور جس میں انہوں نے سراج اور درد کی شاعری کو رکھا ہے ان کیفیات عشق تک تو ولی کی رسائی ناممکن ہے لیکن کچھ فارسی شاعری کے اثرات اور مختلف علاقوں یا خانقاہوں کی سیر ان کی میلان طبع کو تصوف کی چوکھٹ کی طرف موڑ دیتی ہے۔ جس کے سبب ان کی شاعری میں بے نیازی اور قناعت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

زندگی جام عیش ہے لیکن فائدہ کیا اگر مدام نہیں
خودی سے اولا خالی ہوا ہے دل اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

ہر ایک سوں متواضع ہو سروردی یہ ہے
سنبھال کشتی دل کو قلندری یہ ہے
خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر
کہ عاشقاں کے نزدیک شیشہ پری یہ ہے

اردو ادب میں ولی دکنی کو خاص مقام اور درجہ حاصل ہے۔ اس کی شخصیت جامع کمالات تھی وہ اپنے ادبی کارناموں میں کسی جگہ عالم و فاضل مصلح ومشیر ،صوفی وصافی کی حیثیت سے رونما ہوتا ہے اور کہیں کہیں ادیب وانشا پرداز دکھائی دیتا ہے۔

ولی نے مختلف صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو اس نے خاص طور پر اپنایا۔ ولی کی شاعری بہت پہلو دار نظر آتی ہے لیکن ولی کی شاعری کے دو نمایاں پہلو مجاز وحقیقت ہیں جو کہیں الگ الگ اور کہیں ملے جلے روپ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جہاں اس نے تصوف کو تغزل کے رنگ میں اسی خوبی سے پیش کیا ہے کہ مجاز وحقیقت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ولی کی شاعری کا مجازی پہلو بھی رسمی وروایتی نہیں یہ بھی اس کے قلب ونظر کی سچی روداد ہے۔ مجازی پہلو میں ولی کا محبوب کوئی فرد واحد نہیں ہے بلکہ وہ ہر انسان اس کے لیے محبوب کی حیثیت رکھتا ہے جن میں اس کو حسن ازل کا پرتو نظر آتا ہے۔ حسن کسی صورت میں نظر آئے ولی اس کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یہی شدت احساس اس کا عشق ہے جو اس کے قلب ونظر کی گہرائیوں کا حقیقی ترجمان ہے:

درو وادی حقیقت جن نے قدم رکھا ہے

اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

پھر وہ جلد ہی حقیقت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے

کہ فن عاشقی عجب فن ہے

مجاز ہو یا حقیقت اس شدت احساس سے جو کیفیت رونما ہوتی ہیں دل میں جو جذبات و احساسات موجزن ہوتے ہیں اور جو وارداتیں گزرتی ہیں ولی ان کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح اس کی آپ بیتی جگ بیتی کی شکل اختیار کر لیتی ہے یہی مادی فضا اور ہمہ گیری و ہمہ جہتی اس کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ولی کے خلوص و احساس کی وجہ سے اس کے کلام میں سوز و گداز بھی بلا کا پایا جاتا ہے اور اسی خلوص نے اس کے کلام کو پرتاثیر بھی بنا دیا ہے۔ اس کی شدت احساس اور خلوص و احساس کی تصدیق اس کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے۔

بے حقیقت گرم جوشی دل میں نین کرتی اثر

شمع روشن کیوں کہ ہووے شعلہ تصویر سوں

ولی کا کلام اس کے تصورات و تاثرات کا حسین امتزاج ہے۔ ولی عشق کو شغل و فن، یاری و رہبر گردانتا ہے وہ اس کو انسانیت کی اہم ترین قدروں میں شمار کرتا ہے۔ عشق کو مادی علم میں انسان کو مسرور کامیاب بنانے کا بھی آلہ تصور کرتا ہے مگر یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ یہ مرحلہ شوق بہت دشوار گداز ہے اسی لیے وہ کہتا ہے۔

اے ولی طرز عشق آسان نہیں

آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے[۱۳]

خوب روح خوب کام کرتے ہیں

ایک نگہہ میں غلام کرتے ہیں

اس رنج و غم اور گریہ و شوق میں اس کا فلسفہ غم مضمر ہے۔ اس کے یہاں عاشق کے درد و غم اور اس کے پردے میں حیات انسانی کی محرومیوں کے ذکر میں قنوتی (غم) رجحان نہیں پایا جاتا بلکہ شرح غم کے مطالعہ سے بلند حوصلگی و توانائی پائی جاتی ہے ولی کا فلسفہ غم اس شعر سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

جب تلک ہے آسمان وزمین جگ میں برقرار
جیوں پھول اس جہاں کے چمن میں ہنسا کرو

☆

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ولی کے عہد میں اردو شاعری پر ہندی کا اثر غالب تھا۔ ولی نے ہندی کے ضروری اور غیر ضروری عنصر میں امتیاز کیا اور چھانٹ پھٹک سے کام لیا اس تراش وخراش سے زبان میں نکھار اور وسعت پیدا ہوگئی ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مذہبی، تاریخی، تلمیحوں تشبیہوں اور استعاروں ، دریاؤں پھلوں سازوں راغوں کو شاعری میں جگہ دے کر اپنی وسیع القلبی ،حب الوطنی اور دور بینی کا ثبوت دیا۔ ولی کے یہاں ایسے اشعار کی کثرت ہے جو زندگی کے گہرے اور رنگا رنگ تجربات کو سامنے لاکر ہمارے شعور واحساس کا حصہ بنادیتے ہیں ۔ اس کے اشعار سوتے ہوئے جذبوں کو جگا کر ہمارے شعور کو وسیع اور سہل بنادیتا ہے۔

شب فرقت میں مونس وہمدم
بے قراری وآہ زاری ہے

ولی نے غزل کا دامن اپنی کاوشوں سے اتنا وسیع کردیا کہ اس میں ہر قسم کے خیالات، موضوعات، احساسات، تجربات، جذبات اور واردات کے اظہار کا سلیقہ پیدا ہوگیا اور اردو غزل کو وہ رنگ سخن مل گیا جو آج بھی زندہ اور باقی ہے۔ ولی کی غزل میں اردو غزل کی کم وبیش وہ ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں جو سراج سے لے کر داغ تک مختلف شاعروں کی انفرادیت کی نشانیاں ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

1. Agha Mehdi Husain, *Rise and Fall of Muhammad Bin Tughluq* (London: Luzac & Co., 1983), pp. 108- 118; Richard M. Eaton, 'The Rise of Written Vernaculars: The Decan, 1400-1650', in Francesca Orsini and Samirah Sheikh ed. *After Timur Left: Culture and Circulation in fifteenth-century North India* (Delhi: Oxford University Press, 2014), pp. 116-117; Habib and Nizami eds., *A Comprehensive History of India*, Vol. V, pp. 506-515

۲۔ شیخ چاند، ولی کی اہمیت، مرتب سید احمد، یادگار ولی، ص ۱۰۸

۳۔ علی احسن مارہروی، کلیات ولی اورنگ آبادی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۷، ص ۱۹۸۔۱۰۴

۴۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۶، ص ۳۶۔ ۳۹

۵۔ وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج، ص ۲۳۵

۶۔ کامل قریشی: اردو غزل، ص ۳۸

۷۔ جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، ص ۵۴۰

۸۔ نور الحسن ہاشمی، کلیات ولی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۸، ص ۲۰۳

۹۔ سید مسعود حسن رضوی: ہماری شاعری، ص ۱۳۶

۱۰۔ نور الحسن ہاشمی، کلیات ولی، ص ۲۳۱

۱۱۔ علی احسن مارہروی، کلیات ولی، ص ۱۳۲

۱۲۔ نور الحسن ہاشمی، کلیات ولی، ص ۸۳

۱۳۔ نور الحسن ہاشمی، کلیات ولی، ص ۲۸۳۔

The Role of "Zuljanah" in The Battle of Karbala

Dr. Syeda Farhat Fatima

Visiting Faculty in Communication Skills

School of Planning and Architecture

Jawaharlal Nehru Architecture and Fine Arts University Hyderabad

Overview

Zuljanah was pure bred, striking arabian horse whose ancestry can betraced back to many generations. He had adelicately chiseled small head, narrow muzzle, deep Jowls, wide-set large prominent eyes, long arching neck and high tail carriage. His entire appearance exuded elegance, nerve, live liness and nobility. he was strong-boned, sophisticated and bright and is mostly said to be white in color and had high power of endurance. His persona exuded that he was raised with love, care and affection. He was trained to have excell entmanners. "Zuljanah" means ahorse which rides whith his two wings and because of his speed he was given this name. His majoir traits were his loyalty and earnestness towards his 'Agha' or master

Hussain Ibn Ali (a.s.). This paper aim to stop ortray the faithfulness and sincerity of Zuljanah towards his Master.

Keywords: Conveyance, duty, faithfulness, devotion, sincerity

Preface

The Holy Quran States in Surah Nahl:

And He made horsesand mules and asses that ye might ride up on them and as an adornment; and createth He what ye know not (16:8)[1]

The above Ayat (16:8) refers to the means of Communication, it is asserted that (God) will add something besides what is already known, (i.e., what is unknown) and the purpose of it is to straighten or shorten the way and facilitate the conveyance towards reaching its destination. Asserting that providing this facility is His duty, it indicates that along with the straight ways there are crooked ways also, and God does not force anything on any one. 2

In simple words the above Ayat (16:8) means we have to choose our own path, right or wrong is our own discretion. God only facilitates us the way and means of transport. Imam Hussain Ibn Ali's means of Conveyance that Allah (s.w.t) facilitated towards his straight path was his dearly loved horse Zuljanah, this horse was gifted to him by his maternal grand father Prophet Mohammad (p.b.u.h). Zuljanah was previously known as Murtajiz. Murtajiz means the thunder of cloud.

Murtajiz was bestowed with melodious neighing voice by Allah (s.w.t).

Scrutiny of Poetry

There are eight names of horses given in the Holy Quran. Among these eight names one is 'Jiyad' which means Jawad. Jawad is a horse whose chief quality is swiftness, a fast runner horse of high breed who serves his entire speed in running fast. The famous 18th century Urdu poet of Awadh; India, Mir Baber Ali Anis used the word 'Jawad' in his verses of poetry to describe Zuljanah.

خوش خو تھا، خانہ زاد تھا، دلدل نژاد تھا
شبیر بھی سخی تھے، فرس بھی جواد تھا

Transliteration

Khush kun tha khanazad tha, Duldul nishat tha
Shabbir bhi sakhi thay, Faras bhi Jawad tha (Akhtar 34) 3
He (Zuljanah) was not only pleasurable and serf but also, He was energetic like DuldulShabbir was generous and his horse was also generous . (Translated by Fatima, Farhat)

In the above line's poet compares Zuljanah with Duldul, Duldul was the horse of Prophet Mohammad (p.b.u.h) which Imam Ali Ibn Abi Talib rode in the battle of Jung e Khyber and Jung e Nahrwan. Therefore, Imam Ali (a.s.) is also known as Shah e Duldul. Imam Ali has named him Duldul due to his

great speed.Zuljanah was also very generous as his Master.

According to the great 18th century poet of Lucknow, India Mirza Salamat Ali Dabir who states in his poetry lines of Marsia or Elegy that, Zuljanah was in the line of succession of Duldul and Barq (both were horses of Prophet Mohammad)

سُرعت میں بسکہ تیز رووں سے وہ پیش تھا
سُو نامِ ذوالجناح پہ بھی پہلے پیش تھا
ذلدُل نسب، براق حسب، برق کیش تھا
قدرت میں دَور چرق تھا کم اور وہ پیش تھا

Transliteration

Surat mein baska tez roo'oh se woh pesh tha
Soa name' Zuljanah pe bhi pahle pesh tha
Duldul Nasab, Barq Hasab, Barq Kesh tha
Qudrat mein duur charq tha kum aur woh pesh tha. (*Dabir Shayar e Dabeer Pg. 145*) 4

In face he was bright, swift and always stood first compared to all other souls.

Though his name was Zuljanah, but he was swifter than his name.

He was from Duldul's lineage, Barq's pedigree and had hair which shined as Barq (lightening).

He was far more powerful, light weight, and was readily accessible (Translated by Fatima, Farhat)

If Zuljanah could speak in human language than he would describe his master as 'Hussain Ibn Ali' is the name of that radiant glow which has saved the cruiser of humanity from tumbling into deep waters. He (a.s) has not only helped the boat of humanity to land on the safe shore but also by his colossal sacrifice has given life to humanity. He is the savior of all the innocents from tyranny. There are no two opinions about this; any human being from any walk of life if he/she is a righteous person and has a pure heart will be attracted towards Hussain Ibn Ali (a.s.) and his sacrifices in the Battle of Karbala.

On second Moharram while riding Imam Hussain (a.s.) on his back suddenly Zuljanah stopped. Imam Hussain cajoled him to move forward but he did not move an inch, then Imam tried to ride six other horses and all of them refused to move an inch forward. Imam Hussain knew that it was his place of final destination i. e., his Qatalgah.5 It is said that there were twenty horses along with Imam Hussain in Karbala all were the horses of Prophet Mohammad (p.b.u.h) and on different occasions he has ridden them. At various occasions and in wars Imam Ali Ibn Abi Talib, Imam Hasan and Imam Hussain also rode them. (Zameer Akhtar Zuljanah pg.43)6

In the battle of Karbala when Hussain ibn Ali's relative kith

and kin helped him by portraying a great face of humanity by sacrificing their lives, in the same way the animal kingdom can be proud of Zuljanah as he has presented an example of sincerity, honesty, devotion towards his Master. Zuljanah has helped Hussain Ibn Ali till his last hour of life in the Battle of Karbala.

The Battle of Karbala started with arrows coming from the army of Umar Ibn Saad (The Commander of ibn Ziad, under the reign of Yazid Ibn Muawiya). The arrows were shooted as if they were raining them. Many horses of Hussain ibn Ali's army were wounded and some of the soldiers became horseless. Can anyone say that at the moment Zuljanah was not wounded? Whenever a Mujahid was martyred from the small band of soldiers of Hussain Ibn Ali, Maula himself used to go and bring him in the Qaimagah riding on Zuljanah along with Hazrat Abbas and Ali Akber on their horses. And a time came when no one was left even Hussain ibn Ali's infant son Ali Asghar has attained Shahadat. Imam came into the tents for his last farewell.

After bidding farewell to fourth Imam Zain ul Abedien (a. s.) and his family, Imam Hussain came out. He was about to go to the battlefield but there was no one to mount him. He remembered Abbas, Akbar, Qasim and Aoun o Mohammad

and was sad and was standing silently in thoughts. His sister Zainab Bint Ali brought the horse and helped him to mount. Zuljanah took a step and stopped, Maula Hussain said to him, oh my honest, faithful horse, you have been with me since morning, helping me to bring the corpses of my loved ones. I know you are hungry, thirsty, tired, but you have been with me in all the steps of battle, you are wounded, but we have been together since our childhood. This is my last ride. Why will be Hussain alive after this? I have shown you the place of my martyrdom. Take me to the Maqtal, to my last destination. But the horse did not move forward. He by the shake of his neck gestured towards his hoofs. His (Zuljanah's) eyes were shedding warm tears. Maula Hussain Ibn Ali (a.s.) saw his little beautiful daughter Sakina, embracing the hooves of Zuljanah and was pleading, 'Oh! Zuljanah do not take my father to Maqtal.7 Since morning whoever went to Maqtal did not return. Hussain Ibn Ali got down from the horse and picked her in his lap; kissed her and said, my darling daughter let me go to the battlefield. Sakina cried 'Baba' Uncle Abbas went into the battle field and did not return. Brother Akbar went and did not return and now you are going. Please don't go. This was the hardest time for our Imam Hussain Ibn Ali (a. s.) He handed Sakina to his sister Zainab Bint Ali and went

towards the battlefield.

He gave Rajaz i.e., his introduction and said, Do you know this horse on which I am mounted. They said yes, we know it is the horse of Prophet Mohammad. Whose 'Amama' is this which I am wearing? (Amama is an outer garment consisting of a large piece of white cloth.). They said it is of your grandfather Prophet Mohammad (p.b.u.h). But still after saying everything they showered Hussain Ibn Ali with arrows. Hussain Ibn Ali started the war in response to their arrows. He fought with the Yazid's lashkar (army) in seven rounds. Sketch a picture of Zuljanah in your mind's eye. In the Qatalgah, where he was besieged in the encounters of war with his master toppled by the thirst, the acidity of his chest, his pain by seeing his master in pain. Every ounce of him was devoted in helping his master. Mir Baber Ali Anis describes this very beautifully in his poetic verses:

غصے میں وہ تن تن کے دہانوں کو چباتا
اور جوشِ شجاعت میں وہ کف مُہ سے گراتا
ہر صف میں کبھی جھوم کے آتا کبھی جاتا
تلوار کی زد سے کبھی آقا کو بچاتا
ٹاپوں سے تہلکتی تھی زمیں حشر بپا تھا
اس صف میں جو کجلی تھا تو اس صف میں ہَوا تھا

Transliteration

Gusse mein woh tan-tan ke dahano ko chabhata

Aur Josh e Shujaat mein woh kaf mauh se giraata

Har saf mein kabhi jhum ke aata kabhi jaata

Talwar ki zad se kabhi aaqa ko bachata

Tapo se thalakti thi zameen, hashr bapa tha

Iss saf mein jo bijli tha toh uss saf mein hawa tha

(Anis Anees ke Marsiye pg 115)8

In pent-up anger he (Zuljanah) was grinding his teeth And in spirit of bravery he was expelling sputum from his mouth

In every row he now and then swinged and came and then went back Sometimes He saved his master from the blow of sword From his hooves mud was falling as if apocalypse has come If he was a thunderbolt in this row than he was air in that row (translated by Fatima, Farhat)

Zuljanah was swift; no one would say he was a parched, hungry, weary horse. He was one with his master's wishes and commands. He moved like thunder among the regiments and tried to save his master. Thousands of enemies of Hussain Ibn Ali surrounded him from all sides and were throwing arrows, spears at him. At that moment, Maula Hussain Ibn Ali was fighting with them with his powerful strokes. From all-around arrows, spears, swords and saddle axe were falling on Hussain Ibn Ali. Was Zuljanah Safe? At this crucial moment Hussain

Ibn Ali's Horse Zuljanah was performing the role of a brave, tough, selfless, unafraid votary. He was in the role of a faithful helper saving his master from the attacks of the opponents. He was also helping Hussain Ibn Ali by stamping and wounding his enemies.

And that time came when Hussain Ibn Ali (a. s.) was badly wounded and said to Zuljanah, Oh my dear Horse, can you hear my mother's voice. Zuljanah can you take me near my son Ali Akber, I want to see him one last time. Zuljanah took Hussain Ibn Ali (a. s.) to the place where Ali Akber was lying, badly wounded, tresses submerged in his own blood and the sand of the desert. Hussain said to Ali Akber dear son you haven't seen the fight of your father, the thirsty, and the hungry, traumatized father. Then he commanded Zuljanah to take him to the 'Nashaib' where his mother (Prophet Mohammad's [p.b.u.h] daughter, Fatima Az Zehra) was waiting for him, which was the place of his martyrdom.

Imam Hussain Ibn Ali was badly wounded and asked Zuljanah to sit down, so he could get down. The horse was reluctant as he knew the tyrants were around to behead his Agha. Imam Hussain told him, 'There are no words to praise you dear, Zuljanah. You have helped me till my last hour and now it is time of Asr (evening Prayer) and it is also the time of my

Shahadat. I need to do Sajdah on the land of Karbala. He kept his head on the yaal (mane) of the horse and said to his beloved Zuljanah. Go to the Dewdi, 'Oh! My grandfather's rehwar (horse); now any moment these tyrants will behead me. Go and convey to Zainab that be careful with Sakina. Be with the womenfolk till my head is beheaded and then take Banu to whichever place God orders you.

After Zuljanah's constant efforts to safe his master, the war was over and his master came down from his saddle placed on his back. His master was surrounded under the circle of tyrants from all sides. Zuljanah saw his master soaked in his own blood and with grief he started hitting his head on the ground. And then he remembered his master's words and he went to convey his master's message to Bibi Zainab. When Bibi Zainab saw Zuljanah, she said to him, go back to the Maqtal, Oh! My grandfather's rehwar and protect my brother? Zuljanah went back to Maqtal and tried to protect his master. It is recorded that he killed forty soldiers of Yazid's army to protect his master (Akhtar pg.57)9. Yazid's army was furious and wanted to kill Zuljanah but Umar Ibn Saad, Commander of Ubayd Allah Ibn Ziad's Army (Umayyad Governor of Basra, Kufa and Khurasan under the reign of Yazid Ibn Muawiya) commanded the army, I want Hussain's (a.s) horse alive as I

want to take him as war booty. This horse is very precious as it is the horse of Prophet Mohammad (s.a.w.a) Catch him alive. Ironical, isn't it? They were killing the beloved grandson of Prophet Mohammad and wanted to save his horse.

Yazid's soldiers ran after Zuljanah to catch hold of him. He ran to get away from them after taking a circle when he came back to his master. He saw his master's head on a lance, beheaded from his body. His master's neck was oozing blood. Zuljanah soaked his forehead in his master's blood and went towards his master's Qaimagah. It was Zuljanah who took the message of the Martyrdom of his master, Hussain Ibn Ali (a.s) to the women folk of his master. Till today he (Zuljanah) is remembered for this last task or service he did.

When he understood that, now I cannot help my master in anyway and his master has come to his pre-destined destiny. Then he took the task on himself and went to the tents of womenfolk of Hussain Ibn Ali and neighed loudly. When the Bibi's saw him rider less and his wounded body with all arrows pierced in it. His head soaked in the blood of his master. His bloodshed eyes due to the trauma he just faced and the loss of his dearly loved master. Zuljanah was the first who gave Pursa or condolences to the household of Hussain Ibn Ali. (a.s.) Mir Baber Ali Anis describes the condition of Zuljanah beautifully

in the following verses.

دیکھا یہ ذوالجناح کا سیدانیوں نے حال
خالی ہے زین، اور ہے ماتھا لہو سے لال
گردن پہ اس طرح سے ہے بکھری ہوء ایال
جس طرح کھولتی ہے زنِ سوگوار بال
روتا ہے یوں وہ غم میں شہِ نامدار کے
جیسے پسر کو روتی ہے ماں داڑھیں مار کے

Transliteration

Dekha ye Zuljanah ka Syedniyon ne haal

Khali hain zeen aur hai matha laho mein lal

Gardan pe iss tarah se hai bikhri huwi ayal

Jis tarah kholti hai zane soghwar baal

Rota hai yun woh ghame Shahe naamdar ke

Jaise pisar ko roati hai maa dhade mar ke (Anis Anees ke Marsiye pg 249)10

The Women folk of Ahl e Bayt saw the condition of Zuljanah

His rider's seat is vacant and his forehead is red in blood

His mane on the neck are scattered in the similar way

As if a beloved affected with grief unlocks her hair.

He is crying in sorrow of the celebrated King (Hussain Ibn Ali a.s.)

Like a mother weeps and yells in distress for her deceased son. (Translated by Fatima, Farhat)

Conclusion

Zuljanah will be remembered in the hearts of righteous people till the name of Hussain Ibn Ali will be present. Both are eternal. Zuljanah has shown us the true meaning of faithfulness and devotion and essence of honesty and earnestness. He showed us the importance of commitment and genuineness in relationships. In many Asian Countries the Shabih or replica of Zuljanah is taken out as a respect and remembrance of his sincerity and commitment towards his master Hussain Ibn Ali (a.s.). Shia's and followers of Hussain Ibn Ali (a. s.) give reverence to the Shabih of Zuljanah for his unconditional devotion towards his master but they do not worship him.

☆☆☆

Reference:

https://www.al-islam.org/enlightening-commentary-light-holy-quran-vol-8/section-1-existence.allah.proved.nature

1. *The Holy Quran The Final Testament Trans* Agha Pooya Yazdi and S.V. Mir Ahmed Ali, Elmhurst, New York, Tahrike Tarsile Quran, Inc. U.S. Fifth Edition 2005 (16:8)

2. *Naqvi, Zameer Akhtar Zuljanah* (2007) Markaze Uloom Islamia, Karachi pg.34

3. *Dabir, Mirza Salamat Ali Shayar e Dabeer* Edition 1 (1951) United India Press, Lucknow pg.145

4. https://www.al-islam.org/husayn-saviour-islam-sv-mir-ahmad-ali/prophesied-desert-karbala

5. Naqvi, Zameer Akhtar *Zuljanah* (2007) Markaze Uloom Islamia, Karachi pg.43

6. https://www.al-islam.org/tears-karbala-liakat-dewji/majlis-11-imam-husayn

7. Anis, Mir Baber Ali *Anees ke Marsiye* (1990) II Edition, Editor Hussain, Saleha Abid Taraqqui Urdu Bureau, New Delhi pg.115

8. Naqvi, Zameer Akhtar *Zuljanah* (2007) Markaze Uloom Islamia, Karachi pg.57

9. Anis, Mir Baber Ali *Anees ke Marsiye* (1990) II Edition, Editor Hussain, Saleha Abid Taraqqui Urdu Bureau, New Delhi pg.249

October to December 2021, Vol.03, Issue: 04, ISSN 2582-1229 E-ISSN 2582-9157

Quarterly Delhi

Tareekh e Adab e Urdu

Editor: Dr. Md. Yahya Saba

UGC Care Listed
International Peer Review
Refereed Jouirnal

www.tareekheadabeurdu.com